سیاسی مضامین وتقاریر کا مجموعہ



انقلابی انگارے

مرتبہ

جی۔ آر۔ سہگل

مترجمہ

روشن۔ بی۔ اے

ملنے کا پتہ

جے ہند پبلشرز (رجسٹرڈ) میدان بھائیاں
لاہور

N. D. SAHGAL & SONS (of Lahore)
Church Road; Kashmiri Gate,
Sales Depot:- Chowk Fatehpuri, DELHI

(جملہ حقوق محفوظ ہیں!)

پبلشرز

کنول بک کلب ڈبی بازار لاہور

بار اوّل

قیمت ~~۔/~~ 2=25

فہرس:-


GOVT GIRLS COLLEGE SRINAGAR ACC. NO 13913 LIBRARY

پنڈت جواہر لال نہرو

۱۔ ہندوستان کی آزادی کا سوال

مصائب کے گذشتہ چند ہفتوں نے ہمیں بیچین کر دیا ہے۔ خوش قسمتی سے جنگ تو ختم ہوا۔ مگر نقصان عظیم تو ہو کر ہی رہا۔ اور مستقبل جنگ کے امکانات اور جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن حالات سے تاریک بن گیا۔

یورپ میں جب امتحان کا وقت آپہنچا۔ تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ حقیقی امن اور انقلاب کے حامیوں میں کافی استحکام نہ تھا۔ غیر ملکی دشمنوں نے اتنا نقصان نہیں کیا جتنا کہ اپنے ہی ملک کے رہنے والے ترقی پسند لوگوں نے۔ جو کہ غیر ملکی دشمنوں کے طرفدار تھے۔ انہوں نے خفیہ طریقہ سے جمہوریت اور آزادی پر حملے کئے۔ اور یورپ میں تشدد اور حیوانی طاقت کی کامیابی ممکن بنا دی۔ ان اور دیگر جمہوریت پسند ممالک کی ترقی یافتہ حکومتوں کی شکست کا شائد اتنا ڈر نہیں تھا۔ جتنا کہ ان کی فتح کا۔ کیونکہ یہ فتح تو حقیقی جمہوریت کی جیت ہوتی۔ اور عین ممکن تھا۔ کہ یورپ میں اس سے فاسزم کا خاتمہ ہی ہو جاتا۔ لیکن انہیں تو چاہے جیسے بھی ہو۔ فاسزم کو یورپ میں برقرار رکھنا تھا۔ اس کے لئے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے وہ قیمت بے شک بہت زیادہ ہو۔ اور جب تک تمام دنیا نیست و نابود نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک وہ قیمت ادا کرتے رہنا ہوگا۔

ہندوستان کے لوگ بہت تکلیف اور دکھ کے ساتھ واقعات کے عمل کو
دیکھتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی امن اور جمہوریت نواز آزادی کے حامی ہیں۔
اس لئے جمہوریت کی مکمل تباہی کو دیکھ دیکھ کر انہیں سخت صدمات
ہوتے رہے ہیں۔ ان کے لئے اطمینان کی محض اتنی ہی بات ہے۔ کہ اس
بیحرمتی اور غداری میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں رہا۔

آج تمام مغربی دنیا سے انگلینڈ اور فرانس کی دھاک اور عزت
اٹھ چکی ہے۔ بدقسمتی سے ان ممالک کے ترقی پسند لوگوں کی عزت بھی اس
سے مٹ گئی ہے۔ اور ان پر اب کسی کو قطعی کوئی بھروسہ نہیں جب مصیبت
سر پہ آئی۔ تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ مشترکہ طریقہ پر اس کے خلاف کھڑے
بھی نہ ہو سکے۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک انہوں نے اس واقعہ
سے کافی سبق نہیں لیا ہے۔ ہندوستان تو آج پہلے سے بھی زیادہ اس بات
کو محسوس کر رہا ہے۔ کہ اپنی متحدہ طاقت اور قربانی کے ذریعہ سے ہی وہ
مکمل آزادی کے مقصد کو حاصل کر سکتا ہے۔

ہندوستان کا جذبۂ خودداری

ہندوستان اب کمزور نہیں ہے اس میں خودداری آ چکی ہے اور
اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو یہ محسوس کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان
یہ سیکھ چکا ہے کہ چاہے جو بھی نتیجہ نکلے۔ لیکن ہم برائی اور اپنے سے
زیادہ جسمانی طاقت کے سامنے جھک نہیں سکتے۔ اس لئے اپنے ملک
کی آزادی حاصل کرنے کے لئے تو ہم اپنی طاقت پر ہی بھروسہ رکھتے
ہیں۔ لیکن موجودہ دنیا میں خاص کر میونخ کے واقعہ اور یورپ میں فاسسٹوں
کے عروج کو دیکھتے ہوئے قومی تنگ خیالی سے غور کرنا بیوقوفی ہوگی۔

حال کے واقعات نے تعجب انگیز صفائی سے یہ ظاہر کر دیا ہے۔ کہ آزادی ناقابل تقسیم ہے۔ اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ یہ ممکن نہیں کہ دنیا کے کچھ حصوں میں آزادی کا قطعی نام و نشان بھی نہ ہو۔ دونوں کے درمیان ٹکر ہو کر رہے گی۔ کیونکہ فاسزم کی نظروں میں تو جمہوریت پر مبنی آزادی کی ہستی ہی ایک بڑا بھاری گناہ ہے۔ اس لئے فاسزم تو ہمیشہ ہی دوسرے ملکوں کی جمہوریت پسند آزادی کو سلب کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اس لئے اس تلخ حقیقت کو دیکھتے ہوئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو فاسزم کے سامنے جھک جائیں اور آزادی کا گلا گھونٹتے جائیں یا ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اور اس کے سامنے سر جھکانے سے قطعی انکار کر دیا جائے۔ برٹش حکومت نے پہلی پالیسی اختیار کر رکھی ہے یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کے لئے جھکنا نہیں۔ کیونکہ وہ تو خود ہی فاسزم کے حامی ہیں۔ لیکن جنہیں آزادی اور جمہوریت کی پرواہ ہے وہ کس طرح ایسی پالیسی اختیار کر سکتے ہیں؟ پھر وہ آخر کیا کریں؟

سپین کی جمہوریت کا تو یہی نعرہ ہے کہ مقابلہ کرنا ہی فتح ہے۔ اور اس نعرہ کو شان کے ساتھ انہوں نے اپنایا ہے۔ یورپ میں اکیلے وہی ہیں جنہوں نے دکھا دیا ہے۔ کہ جمہوریت اگر وہ چاہے۔ تو مصیبتوں کے پہاڑ سر پر ٹوٹنے پر بھی اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔

ہمیں اگر فاسزم کا مقابلہ کرنا ہے تو اسی طرح کے خیال کو سامنے رکھ کر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ کر لینا ہو گا۔ کہ موت کا سامنا ہونے پر بھی ہم نہیں جھکیں گے بلکہ اپنی آزادی اور اصول پر پورے استقلال کے ساتھ آخری دم تک ڈٹے رہیں گے۔

انگلینڈ اگر سچ مچ جمہوریت کے لئے لڑتا۔ تو یقیناً تمام دنیا کی ہمدردی اور تائید اسے حاصل ہوتی۔ لیکن اپنی نوآبادیوں کو اپنے ماتحت رکھنے کے لئے لڑنے والے شہنشاہیت پرست انگلینڈ کے ساتھ کون ہمدردی ظاہر کرے گا؟

انگلینڈ اور فرانس کی کمزوری

پچھلی مصیبتوں کے دنوں میں انگلینڈ اور فرانس کی سب سے بڑھ کر کمزوری تھی ان کی شہنشاہیت — شہنشاہیت کبھی جمہوریت کی تائید نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ تو دل سے فاسزم سے ہمدردی رکھتی ہے برٹن اور فرانس کی شہنشاہیت کا بہت جلد خاتمہ ہوگا۔ لیکن اگر ان کی موجودہ پالیسی قائم رہی۔ تو نہ صرف شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگا بلکہ ان کو ذلیل و رسوا بھی ہونا پڑیگا۔ اور ان کی جگہ فاسسٹ طاقتیں زور پکڑینگی اجتماعی حفاظت کا مقصد تھا مختلف ممالک کے ظالمانہ حملوں کو روکنا۔ لیکن شہنشاہیت کے اصول پر مبنی ہونے کی وجہ سے یہ اجتماعی حفاظت کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اور جب تک اس بنیاد پر یہ قائم رہیگی۔ تب تک یہ جیت نہیں سکتی۔ پھر بھی دنیا میں اگر انصاف اور امن قائم رکھنے ہیں۔ تو اجتماعی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے۔

اب تو ہم لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے۔ ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک نیا یورپ۔ ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے۔ ہمیں اسے سمجھنا چاہیئے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو بنانا چاہیئے۔ واقعات اور حالات بڑی سرعت سے بدل رہے ہیں۔ اور اب تک ہم جو کچھ دیکھتے آئے ہیں۔ اس

میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں ہندوستان کی آزادی کا دل سے خواہاں ہوں۔ اور اس کے لئے میں کوشاں رہونگا۔ لیکن اب قریب پہلے سے بھی زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے بھی فاسزم کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستان کا آزاد ہونا نہایت ضروری ہے۔ آزاد اور جمہوریت پسند ہندوستان ہی دنیا کے دوسرے حصّوں کی جمہوریتوں کو امداد دے سکتا ہے۔ شہنشاہیت کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا غلام ہندوستان دنیا کی جمہوریت کے لئے ایک بار گراں ہی ہوگا۔ اور یہ بوجھ بڑھتا ہی جائیگا اور اس طرح جمہوریت کے مورچوں کو یہ کمزور بنائے گا۔

برٹش شہنشاہیت کو آج فلسطین میں اپنے ہی پیدا کردہ مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور اس سے وہاں زبردست گڑبڑ ہو رہی ہے۔ سرکار اس مسئلہ کو تشدد کے طریقوں سے کبھی حل نہیں کر سکتی۔ وہ شہنشاہیت سے متعلق کسی بھی مسئلہ کو عوام کو دہشت زدہ کر کے نہیں سلجھا سکیگی۔ اس پالیسی سے تو وہ خود اپنے کو کمزور بنا رہی ہے۔ اور ان ملکوں میں فاسسٹوں کی طاقت کو بڑھائیگی۔ جیسا کہ ہم آج عرب میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر ہندوستان کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ تو فلسطین سے کہیں بڑا ملک ہے

برطانیہ کا اگر جمہوریت میں اعتقاد ہے۔ تو اس کے لئے ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ شہنشاہیت کی محبت چھوڑ کر اس کی جگہ ان ملکوں میں جمہوریت قائم کرے۔ اس سے اس کی طاقت کم نہیں ہوگی بلکہ بڑھیگی کیونکہ ایسی صورت میں یہ ملک اس کے بہت طاقتور دوست ہونگے۔ آزاد

جمہوریت (ہندوستان) بیشک یورپ اور ایشیا میں فاسزم کے خلاف ایک زبردست طاقت ہوگی۔

موجودہ حالات کے پیش نظر تقر مباحثی ہوئی جمہوریت کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستان سے برطانیہ کو تعاون دینے کے لئے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے موجودہ رُخ کو یا یورپ کے واقعات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔

۲۔ برٹش سلطنت سے تعلق نہیں رکھیں گے

مکمل آزادی کا اعلان

(آزادی کے اعلان سے متعلق مندرجہ ذیل قرارداد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ذریعہ ۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو منظور ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی نے ملک بھر میں اعلان پڑھے جانے کے لئے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم مکمل آزادی مقرر کیا تھا)

ہمارا یقین ہے کہ دوسری اقوام کی طرح ہندوستان میں رہنے والوں کا بھی یہ نہ مٹنے والا حق ہے۔ کہ وہ آزاد ہوں۔ اور اپنی محنتوں کا پھل کھا سکیں۔ ان کے پاس ضروریات زندگی مناسب مقدار میں ہوں تاکہ انہیں ترقی کا پورا پورا موقعہ مل سکے۔ ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کا یہ حق چھین لے اور اس پر ظلم ڈھائے۔ تو اس قوم کا بھی یہ حق ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس حکومت کو بدل دے یا مٹا دے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کی نہ صرف آزادی سلب کر لی ہے بلکہ وہ عوام کی لوٹ پر قائم ہے۔ اور اس نے ہندوستان کو

مالی۔ سیاسی۔ تمدنی اور روحانی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔ اس لئے ہمارا یقین ہے کہ ہندوستان کے لئے انگریزوں سے تعلق توڑنا اور مکمل آزادی حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

"ہندوستان مالی نقطہ نظر سے تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ ہماری آمدنی کے مقابلہ میں ہم سے بہت زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ہماری روزانہ اوسط آمدنی محض سات پیسے فی کس ہے۔ اور ٹیکس کی جو بڑی رقم ہم ادا کرتے ہیں۔ اس کا بیس فیصدی تو کسانوں سے مالگذاری کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ اور تین فیصدی نمک ٹیکس سے آتا ہے۔ جس سے غریبوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

دیہاتوں کی صنعت و حرفت مثلاً بنائی و کتائی وغیرہ بالکل ختم کر دی گئی ہے۔ اور جیسا کہ دوسرے ملکوں میں کیا گیا ہے۔ ان برباد شدہ دستکاریوں کی جگہ دوسری دستکاریوں کو وہاں رائج نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ کسان سال میں کم سے کم چار مہینے بیکار رہتے ہیں اور کسی قسم کی بھی دستکاری نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دماغ کند ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان سے درآمد اور برآمد ہونے والے مال پر جو زکواۃ یا چونگی لی جاتی ہے۔ اور روپیہ کے متعلق ایسے اصول وضع کئے گئے ہیں۔ کہ ان سے کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں جو مال باہر سے آتا ہے۔ اس میں آدھا حصہ انگلستان کا ہوتا ہے۔ جو زکواۃ آنیوالے مال پر لی جاتی ہے۔ اس کی شرح کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے انگریزی مال کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور اس طریقے سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس سے

کسانوں کا بوجھ کم کرنے کی بجائے یہاں کی حکومت کا جو بہت فضول خرچی پر مبنی ہے۔ خرچ نکالا جائے۔ غیر ملکی تبادلہ کی شرح ایسے من مانے طریقہ پر مقرر کی گئی ہے۔ کہ اس سے اس ملک کے کروڑوں روپے باہر پہنچ جاتے ہیں سیاسی نقطہ نظر سے ہندوستان کا درجہ جس قدر انگریزی عملداری میں کم ہوا ہے۔ اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ کسی بھی اصلاحات سے عوام کو حقیقی سیاسی حقوق نہیں ملے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ اہم ہیں وہ بھی غیر ملکی افسروں کے قبضہ میں ہیں۔ آزادی کے ساتھ صحیح رائے ظاہر کرنے اور متحد ہونے کے حقوق ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اور ہمارے بہت سے ہندوستانی غیر ممالک میں رہنے کے لئے مجبور ہیں ــــ اور ہندوستان واپس نہیں آسکتے۔ ہماری حکومت کرنے کی اہلیت کا خون ہو رہا ہے۔ اور لوگوں کو معمولی معمولی دیہاتی عہدوں اور محرریوں پر ہی صبر کرنا پڑتا ہے۔

تہذیب کی ترقی کے پیش نظر اگر غور کیا جائے۔ تو ہمارے ہاں جو طریقہ تعلیم رائج کیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں ہندوستانی تہذیب کی بنیادوں سے ہی بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ ہماری تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ ہم انہیں زنجیروں کو محبت سے گلے لگاتے ہیں جو ہمیں اسیر بنائے ہوئے ہیں۔ روحانی پہلو سے اگر دیکھا جائے۔ تو ہتھیاروں کے زبردستی چھین لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ہم بزدل بن گئے ہیں۔ اور غیر ملکی حکومت نے اپنا قبضہ جمائے رکھنے کے لئے جو غیر ملکی فوج رکھ چھوڑی ہے۔ اس سے ہمارے دلوں میں مقابلہ کا خیال ہی باقی نہیں رہا۔ اس کے موجود رہنے سے ہمارے دلوں میں یہ خیال گھر کر چکا ہے۔ کہ ہم اپنا کام خود نہیں چلا سکتے۔ اور

نہ ہی غیر ملکی حملوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ چند دن۔ ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے اپنے گھروں اور خاندانوں کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے ہمارا یہ کامل یقین ہے کہ جس حکومت نے ہمارے ملک پر اس قسم کی آفتیں نازل کی ہیں۔ اس کے ماتحت رہنا خدا اور انسانیت کی نظروں میں ایک گناہ ہے۔ لیکن ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اپنی آزادی حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ تشدد نہیں۔ اس لئے ہم اپنے تئیں اس طرح تیار کریں گے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔ برٹش حکومت سے اپنی خوشی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں گے۔ اور ستیہ آگرہ کے لئے جس میں عدم ادائیگی ٹیکس بھی شامل ہے۔ تیاری کرینگے۔ ہم کو اس بات کا یقین ہو چکا ہے۔ کہ اگر ہم اپنی خواہش سے حکومت کی مدد کرنا چھوڑ دیں۔ اور ٹیکس دینا بند کر دیں۔ اور ساتھ ہی حکومت کی طرف سے ستائے جانے کے باوجود عدم تشدد پر قائم رہیں۔ تو اس حیوانی حکومت کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے اب ہم سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں۔ کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کانگرس جو احکامات صادر فرمائیگی۔ ہم ان پر پوری طرح عمل کریں گے۔

۳۔ بین الاقوامی حالات کا ہندستان پر اثر

دوسرے ملکوں میں جب آزادی چاہنے والوں کی فتح ہوتی ہے۔ تو ہمارے ملک میں بھی ان خیالات کے لوگوں کی طاقت بڑھتی ہے۔ اور جب کسی دوسرے ملک میں آزادی کی مخالف طاقت کامیاب ہوتی ہے تو ہمارے ملک میں بھی ایسی طاقت کا زور بڑھ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا

ہے۔ اب ہمارا ملک اس طرف خوب دھیان دینے لگا ہے۔ چین میں ڈاکٹروں کا وفد اور سپین میں اناج ہندوستان کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ جب ہمارے ملک کے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں تو ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کی کیا امداد کر سکتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ کیا دس بیس ڈاکٹر یا سو دو سو من چاول کسی ملک میں بھیج دینے سے وہاں کی تکلیف رفع ہو جاتی ہے۔ نہیں۔ بلکہ اس طرز عمل سے آپ کے ملک کے لوگوں کے نیک خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان باتوں سے آپ اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ کہ فلاں ملک سے ہماری ہمدردی ہے۔

ہم جو آزادی چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب عوام کی حکومت ہے۔ اس لئے پبلک کو بھی بین الاقوامی حالات سے با خبر رہنا چاہئے۔ اپنے ملک کو اونچا اٹھانے اور سر بلند کرنے کے لئے سب سے پہلے یہاں کے لوگوں کو خود بڑا بننا اور اپنے خیالات کو ارفع رکھنا پڑیگا۔ ایسا کرنے سے آپ کا دھیان چھوٹے چھوٹے سوالات سے آپ ہی دُور ہٹ جائیگا

غیر ممالک میں ہندوستان کی عزت افزائی

دنیا میں آج کل ہندوستان کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے ملک یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ ہندوستان جلد آزاد ہو جائیگا۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ اس مالدار ملک سے ابھی سے رابطہ اتحاد بڑھا لیں۔ تاکہ اس کے آزاد ہو جانے پر وہ اپنی تجارت وغیرہ بڑھا سکیں۔ دس بیس سال کی کشمکش کے بعد اب ہم بھی مزے سے اندازہ لگا رہے ہیں۔ کہ ہماری طاقت میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت کوئی ایسی بیرونی طاقت نہیں۔ جو ہمیں ترقی کرنے سے روک سکے۔

ہمارے عروج کے راستے میں اگر کوئی روکاوٹ ہے۔ تو وہ ہماری اندرونی کمزوری ہے۔

اس وقت دنیا میں سب جگہ جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ نہ معلوم دنیا کا نقشہ کیسا بن جائے۔ ایسے موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیں بھی اپنی اندرونی کمزوری کو دُور کر کے تیار ہو جانا چاہیئے۔ کانگرس کے اندر بھی کچھ خرابیاں آگئی ہیں۔ انہیں بھی جلد دُور کر ڈالنا چاہیئے۔

ریاستی رعایا کی جدوجہد

آج کل کشمیر سے راس کماری تک تمام ریاستوں میں بڑی زبردست جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان مقامات کی رعایا بھی بیدار ہو گئی ہے۔ جو ملک کی آزادی چاہنے والوں کے لئے بیحد امید افزا ہے۔ یہ لڑائی رئیسوں سے نہیں بلکہ برٹش شہنشاہیت سے ہے۔ اسی وجہ سے آج کل ہمارے سامنے ریاستوں کی جدوجہد کا سوال بھی آموجود ہوا ہے۔ بہت سے لوگ جوش میں آکر خیال کر رہے ہیں جس سے وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ ایسے لوگ دوراندیشی سے کام لیں۔ تو کوئی گڑبڑ پیدا نہیں ہو سکتی ادھر ایک دفعہ سب مقامات کا "یوم حیدرآباد" منایا گیا تھا۔ اسی وقت سے لوگوں میں کچھ فرقہ دارانہ جوش دکھائی دینے لگا ہے۔ میں بھی اس کا حامی ہوں۔ کہ ریاستوں میں آزادی کی لڑائی لڑی جانی چاہیئے۔ چاہے وہ کوئی بھی ریاست کیوں نہ ہو۔ مگر میں چاہتا ہوں۔ کہ کہیں ایسا جنگ نہ ہو جس سے سارے ملک کے سامنے ایک نیا اور مشکل سوال آکھڑا ہو۔ ریاستوں میں جدوجہد شروع کرنے کے لئے مناسب موقعہ کی تلاش کرنی چاہیئے۔ تاکہ بُرے نتائج پیدا نہ ہوں۔ ریاستوں والے سیاسی جدوجہد کو فرقہ دارانہ

رنگ دیتے ہیں۔ حیدرآباد کے معاملے کو بھی فرقہ دارانہ شکل دیدی گئی ہے
اس ریاست کا حال بالکل کشمیر سے مشابہ ہے۔ ان دونو ریاستوں کی رعایا
بہت دکھی ہے۔ حیدرآباد کی اکثریت آبادی ہندو اور حکمران مسلمان اور
کشمیر کی رعایا زیادہ تر مسلمان اور رئیس ہندو ہے۔ رعایا جب اپنی
تکالیف کو دُور کرنے کے لئے جدوجہد کریگی۔ تو وہ کشمیر میں خواہ مخواہ مسلم
عوام کے ذریعہ اپنے ہندو رئیس کے خلاف اور حیدرآباد میں ہندو رعایا
کے ذریعے اپنے مسلمان حکمران کے خلاف کشمکش کرے گی۔ ان حالات
میں اس بات کی سخت ضرورت ہے۔ کہ لوگوں کو ستیہ آگرہ کرنے کا مطلب
خوب ذہن نشین کرا دیا جائے۔ ایسا نہ کرنے سے ہی حیدرآباد والے معاملہ
میں فرقہ دارانہ رنگ زور پکڑ گیا۔ کچھ مقامات پر کانگریس کے خیالات کے
لوگ بھی اس جدوجہد میں شامل ہوئے۔ مگر یہ ان کی غلطی تھی۔

۴۔ ہندوستانیو! تیار ہو جاؤ۔ برٹش شہنشاہیت سے ٹکر لینے کیلئے

(ہمارے سامنے ضروری سوال)

ہمارے سامنے ضروری سوال یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنا
اور اس ملک میں آزاد اور مشترکہ جمہوریت پر مبنی حکومت قائم کرنا۔
اس نقطۂ نظر سے ہی ہر بات پر غور کرنا چاہیئے۔

دنیا سرعت سے آگے بڑھ رہی ہے اور ہولناک سلسلہ عمل اس کا
گلا پکڑ رہا ہے۔ ادھر ہندوستان میں پبلک کی مختلف تحاریک کام کر رہی
ہیں۔ اور ساتھ ہی نفاق پیدا کرنے والی طاقتیں بھی اپنی کریہہ شکل
دکھا رہی ہیں۔ ہم لوگ ان حالات میں مخالفت کا سامنا کیسے کرینگے!

ریاستی پبلک کی تحریک

اس وقت ہندوستانی ریاستوں کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان لوگوں کا سوال جو اب تک صبر و اطمینان سے مظالم اور تکالیف برداشت کرتے آ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اب یہ حالات ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے ہیں۔ کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک لاکھوں کروڑوں ریاستی عوام بیدار ہو اٹھے ہیں۔ اور اس آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں جس سے وہ ابھی تک محروم رکھے گئے ہیں۔ اس وقت ہمیں برٹش حکومت کے بہت سے مذموم افعال میں سے محض ایک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ برطانیہ ہی اس مطلق العنانہ طرز حکومت کا جس کا مظاہرہ ریاستوں میں علانیہ ہو رہا ہے سرپرست بنا ہوا ہے۔ پہلے کی طرح ہی آج بھی مہاتما گاندھی ہندوستان کی نرم مگر مضبوط آواز ہیں۔ جو اس شہنشاہیت کو للکار رہی ہے۔ اور اس سے لوہا لینے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ اس اہم کشمکش کے سامنے اور سب باتیں غیر ضروری ہیں۔ کیونکہ انفرادی آزادی۔ ریاستوں کے معاملات اور دیگر سوالات اس بڑی آزادی کی لڑائی سے ہی طے ہو جائیں گے۔

ریاست راجکوٹ اس لپیٹ میں آچکی ہے۔ اور ایک بہت بڑی معزز خاتون شریمتی کستوربا گاندھی بڑھاپے میں پھر جیل میں گئی ہے جے پور نے شہنشاہیت کی طرفداری کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان کے قومی سیوک شری جمنالال جی بجاج جیل میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ اڑیسہ میں برٹش امپیریلزم مظالم اور بیرحمانہ تکالیف اور اول درجہ کی گراوٹ کو قائم رکھنے اور ریاستی رعایا کی بیداری کو کچلنے کے لئے اپنی افواج جمع کر رہا

ہے۔ ٹراونکور میں من مانی کارروائیاں فاسزم کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ میسور میں بھی جدو جہد شروع ہے۔ حیدر آباد اور کشمیر جیسی بڑی ریاستوں میں رعایا کی تحریک فرقہ دارانہ گڑبڑ کے واہیات بہانے سے کچلی جا رہی ہے

ہم لوگ صبر و شکر کے زیر اثر معمولی واقعات میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور بڑے مسائل کو فراموش کر رہے ہیں۔ مگر پھر ہمیں پیغام آ رہا ہے۔ ہندوستان پکار رہا ہے۔ اور وہ پکار بہت زوردار اور مسلسل ہے۔۔۔ تیار ہو جاؤ۔ ہندوستان کے رہنے والو تیار ہو جاؤ۔ کوچ کرنے کا وقت آ رہا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔

۵۔ ہندوستان کدھر جا رہا ہے

"پائنیر" کے مقالہ نویس کا کہنا ہے۔ کہ اگر حکومت سرمایہ دارانہ ہو تو مزدوروں کی حالت بدتر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انہیں حکومت ہمدردی سے جوسیگی۔ اس کھیل کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اشتراکیت میں نظام حکومت کس طرح کا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے حالات سے کس کا فائدہ ہوتا ہے؟ اگر عوام اپنے آپ کو ہی چوسنا چاہیں۔ تو شوق سے ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے پر بھی فائدہ کا حصہ عوام کو ہی ملیگا۔ کسی خاص فرد یا مجموعہ افراد کو نہیں۔

مقالہ نویس دکھی ہو کر پوچھتا ہے۔ کہ آخر فالتو مال کہاں جائے گا۔ سرمایہ داروں کے پرانے اقتصادی اصولوں کے مطابق سوچنے کے علاوہ مقالہ نویس اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ منظم اور متحد سوسائٹی میں فالتو مال

بنیگا ہی نہیں۔ جو بنیگا اس سے لوگوں کے معیار زندگی میں ترقی ہوگی۔ محنت کا پھل لوگوں کو ضرور ملیگا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں کی محنت کا پھل زبردستی چھین لیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اشتراکیت میں ہی لوگوں کو اپنی محنت کا پورا پھل مل سکتا ہے۔

یہ بات بالکل سچ ہے کہ جب باہمی تعاون اور اعتماد پیدا ہوگا۔ تب کوئی شخص یا ملک آزاد ہو ہی نہیں سکتا۔ مجلسی زندگی کے ہر شعبہ میں بھی افراد کی آزادی مقررہ قواعد کے ماتحت ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہے۔ کہ اشتراکیت پر مبنی بین الاقوامی سوسائیٹی میں کسی بھی ملک کو آزادی مل ہی نہیں سکتی۔ جب بین الاقوامی تعاون کے مقاصد سے کوئی ملک اپنی آزادی کے کچھ حصے کو قربان کرتا ہے۔ تو یہ قربانی آزادی کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتی۔ برطانیہ کا ہی ایک حصہ ہونے سے کیا ویلز کم آزاد ہے؟

جی" کا کہنا ہے۔ کہ یہ خیال ہی ماننے کے قابل نہیں کہ اول اور اوسط درجہ کے لوگوں کے مفاد کسانوں اور مزدوروں کے مفاد کے منافی ہیں۔ پھر بھی حیرانی ہے کہ مغربی ممالک کے (جہاں اس مضمون پر خوب غور کیا گیا ہے) سب ہی سنجیدہ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ دونو درجے کے لوگوں کے مفاد ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اگر جی تاریخ کا یا اس مضمون سے تعلق کسی نئی کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ تو ان کی غلط فہمی دور ہو جائیگی۔ اگر وہ کسی کارخانے میں جا کر دیکھیں۔ تو بھی انہیں پتہ لگ جائیگا کہ مالک اور مزدور اپنے اپنے مفاد کو ایک دوسرے سے متضاد سمجھتے ہیں یا نہیں۔

دونوں ہی مبصرین کی اس مضمون سے گہری دلچسپی ہے۔ کہ عدم تشدد کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ میں زبردستی کرنے کا حامی ہوں۔ یہ سمجھا بجھا کر رضا مند کرنے کا۔ جی نے مہاتما گاندھی کی رائے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کس طریقہ پر عمل کیا جائے۔ یہی اولیں سوال ہے۔ میں نہیں جانتا۔ کہ مہاتما جی نے ایسی کوئی یکطرفہ بات کہی یا نہیں کہی۔ یہ ضرور ہے کہ آپ اس پر برابر زور دیتے آئے ہیں۔ کہ ہمارا طریقہ عمل عدم تشدد پر مبنی ہونا چاہیئے۔

میرے مضامین کے متعلق۔ تو اس طرح کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کیونکہ میں نے تو صرف تاریخی حقائق کی روشنی میں اس مضمون پر غور کیا ہے۔ کہ ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ میں نے کسی طریقہ عمل کا ذکر نہیں کیا۔ مگر سوالات کا جواب دیدینا بہتر ہے۔

ذریعہ چاہے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ وہ مقصد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنا مقصد مقرر کر کے ہی اس کے حصول کے لئے کوئی سعی کی جائے۔ طریقہ عمل کے متعلق میں یہ کہدینا چاہتا ہوں۔ کہ میرے خیال کے مطابق دھرم اور پر اُپکار (دوسروں کی بھلائی) کا اُپدیش دینا اس میں شامل نہیں۔ میرے لئے نہ ہی دھرم کی کوئی اہمیت ہے نہ پر اُپکار کی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دھرم اور پر اُپکار کے نام پر فریب اور خود غرضی کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ نیک چلنی۔ صداقت اور روحانیت وغیرہ اوصاف پر میں ضرور اعتقاد رکھتا ہوں۔ مگر میرے یقین کرنے سے ہی وہ ذرائع نہیں بن جاتے۔

ذرایع کا ایک حصہ ضرور ہیں۔

زبردستی کرنا۔ یا سمجھانا بجھانا ان دونوں میں سے نظام سلطنت
کے اصول کی بنیاد کیا ہے؟ اور موجودہ مجلسی زندگی کی بھی! — کیا
زبردستی اور مجبوری کی برابری دونوں کی ہی کوئی بنیاد نہیں۔ فوج۔ پولیس
قانون۔ جیل۔ ٹیکس وغیرہ سب زبردستی کے طریقے ہیں۔ زمیندار جو
لگان اور طرح طرح کے ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ وہ زبردستی
پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ رعایا کو سمجھانے بجھانے پر نہیں۔ مزدوروں
کو پیٹ بھرنے لائق بھی مزدوری نہ دینے والے کارخانے کے مالک
بھی مزدوروں کو منانے پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ زمیندار اور کارخانہ دار
دونوں زبردستی کرنے میں حکومت کی منظم طاقت سے امداد لیتے ہیں۔ اور
مزدوروں کو کام نہ کرنے دینے کے لئے کارخانہ کا دروازہ بند کر دینا یا
مزدوری کم کرنے کی کوشش کرنا کیا سمجھا بجھا کر اپنے حق میں کرنا کہا
جائیگا۔ یہ سمجھ لینا اچھا ہے۔ کہ حاکم اور مالدار طبقہ زبردستی کر کے ہی اپنے
اپنے عہدوں پر قائم ہے۔ سمجھانے بجھانے کی بات کہنا اس طبقہ کے لئے
مناسب نہیں۔ موجودہ طریقہ کے خلاف اور اشتراکیت کے حق میں سب
سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اشتراکیت سے زبردستی مظالم کا خطرہ آہستہ
آہستہ کم ہو کر بالکل ختم ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ موجودہ طریقہ کے بدلے میں ہم تعاون کی بنیاد پر قائم
طریقہ کیسے رائج کر سکتے ہیں۔ اور حکومت حاصل کئے ہوئے لوگوں کو
عہدوں سے کیسے ہٹا سکتے ہیں۔ پائنیر کے مضمون نویس کا کہنا ہے جو ٹھیک
ہی ہے۔ کہ نہ تو سرمایہ دار خاموشی سے اپنی دولت سے محروم ہونا چاہتے

ہیں۔ اور نہ ہی با اختیار لوگ اپنے اختیارات سے۔ تاریخ بھی شاہد ہے
کہ کبھی کہیں کسی با اختیار مجموعہ افراد یا ملک نے اپنی مرضی سے اپنے
اختیارات اور اغراض کو ترک نہیں کیا۔ افراد نے انفرادی طریق پر
شائد ایسا کیا ہو۔ مگر کسی فرقہ نے بحیثیت مجموعی ایسا نہیں کیا۔ ہمیشہ سے
ایسا ہی ہوتا آیا ہے یا ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ کہ با اختیار
لوگوں کے لئے ان حالات میں رہنا یا تو ناممکن ہو گیا یا نقصان دہ۔ ایسا
ہونے سے با اختیار لوگ مجبور ہو کر ٹھیک راستے پر آتے ہیں۔ یہ مجبوری
حیوانی طریقہ سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور مہذب طریقہ سے بھی!
مجھے اس میں رتی بھر بھی شک نہیں ہے۔ کہ ہندوستان میں سیاسی اور
مجلسی انقلاب کے لئے زبردستی کرنا یا دباؤ ڈالنا ضروری ہے۔ پچھلے تیرہ
سال کی ہماری عدم تشدد پر مبنی پبلک تحریک ایسا دباؤ ڈالنے کے لئے
بہت طاقتور ثابت ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ تحریک مخالفین
کے بہت سے افراد کو جانبدار بنا لیتی ہے۔ اور اس مجموعہ افراد کے
اختیارات اور دبانے کی پالیسی کی دنیوی مناسبت کو دور کر کے اس
مجموعہ افراد کے مخالف خیال کو کچھ حد تک کمزور کرتی ہے۔ مگر دراصل یہ
بھی مخالفین یا ملک کو مجبور کرنے کا ہی ڈھنگ ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔ کہ
زبردستی کرنے کا یہ ڈھنگ بہت ہی مہذب اور روحانی ہے۔ اور اس
سے تشدد کا برا انجام پیدا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ ظالمانہ جنگ
کی جگہ یہ روحانی ہتھیار بڑے مزے سے لے سکتا ہے۔ اور اگر تہذیب
ختم نہیں ہو جائیگی۔ تو مہذب دنیا اپنے جھگڑے کے طے کرنے کے لئے بتدریج
اس پُرامن طریقہ سے کام لینے لگ جائے گی۔ مگر میں تو سمجھتا ہوں۔ اور اس

میں کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ عوام کی پُرامن تحریک بھی مجبوری پیدا کرتی ہے۔ اور مخالف کو مجبور کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اشیا کے بائیکاٹ کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے۔

انفرادی طور پر میں نے اس پُرامن طریقہ کو منظور کر لیا ہے صرف اس لئے نہیں کہ وہ مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں یہی طریقہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا یہ یقین کامل ہے۔ اور میں یہ بار بار کہہ چکا ہوں۔ کہ اہنسا کے اصول کو میں بالکل صاف اور واضح نہیں سمجھتا۔ میں تشدد سے عدم تشدد کو بہت بہتر سمجھتا ہوں۔ مگر عدم تشدد (اہنسا) کا سہارا لیکر غلام بنے رہنے کی بجائے تشدد کی مدد سے آزاد ہونے کو اس سے بھی زیادہ اچھا سمجھتا ہوں۔ مگر آج میرے سامنے تشدد کا سوال اٹھتا ہی نہیں۔ کیونکہ میرا یقین ہے۔ کہ ابھی بہت دنوں تک ہمارے لئے یہ پُرامن طریقہ ہی سب سے زیادہ پُراثر طریقہ رہیگا میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ اہنسا پر مبنی عدم تعاون یا پُرامن خلاف ورزی کو میں کمزوری اور بزدلی کی علامت نہیں سمجھتا۔ اس کو میں عوام کی خواہشات کو منوانے کا بہت ہی عمدہ اور زبردست طریقہ سمجھتا ہوں۔

انتظام سلطنت عوام کے ہاتھ میں آجانے پر تشدد اور عدم تشدد کا سوال ضرور اٹھیگا۔ مخالفین نئے طرز حکومت کو اُلٹا دینے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس وقت "جج" نئی سرکار کو یہ مشورہ دیں گے۔ کہ ان مخالفین کو راہ راست پر لانے کے لئے سرکار اپنی طاقت استعمال کرے۔ اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ دھرم اور پرادیکار کا اپدیش دینے سے یہ لوگ مان جائینگے؟ پھر نئی سرکار کو ایسے قانون بنانے پڑینگے جن سے با اختیار

لوگوں کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ اس وقت جی ان مخالفین کو قانون کی تعمیل کی صلاح دیں گے یا اس کی مخالفت کرینگے۔ اگر مخالفت ہوئی تو اس کو رد کا کیسے جائے گا؟

ایک اور سوال ہے جس پر میں غور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے کھدر کا۔ میں صنعتی ترقی۔ اور بڑے بڑے کارخانوں کی قائمی کا خواہشمند ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تمام ہندوستان میں نئے نئے کارخانے کھلیں۔ میں ہندوستان کے سرمایہ میں اضافہ اور ہندوستانی عوام کے معیار زندگی کو بڑھانا چاہتا ہوں۔ میرے خیال سے ایسا تبھی ممکن ہو سکتا ہے۔ جب صنعت کی ترقی سائنٹیفک طریقہ پر کی جائے۔ موجودہ حالت میں ملک میں صنعتی ترقی کا ہونا لازمی ہے۔ تو بھی میں ملک کی موجودہ حالت میں چرخے اور کھادی کا پرچار کرنا چاہتا ہوں میرے خیال سے چرخے اور کھادی کی اقتصادی سیاسی اور مجلسی تینوں طرح سے خاص اہمیت ہے۔ کسانوں کی موجودہ مجلسی حالت میں چرخہ اور کھادی کا کام بہت ہی مناسب ہے۔ اور اس کام سے کسانوں کو کچھ مدد بھی ملیگی۔ اور ان میں خودداری کا مادہ بھی پیدا ہوگا۔ اس طریقہ سے ہمارا عوام سے تعلق زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہ خطانہ ہونیوالا سیاسی ہتھیار ہے۔ کیونکہ اس سے غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنے میں امداد ملتی ہے۔ ساتھ ہی ہندوستانی کارخانہ داروں کو اپنے بنائے ہوئے کپڑے کی قیمت بڑھانے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ جنگ عظیم کے وقت غیر ملکی کپڑا آنا بند ہو جانے سے ہندوستان میں کپڑے کی بہت قلت ہو گئی تھی ہندوستانی کارخانہ داروں نے یہاں پیدا شدہ کپڑے کی قیمت بیحد بڑھا کر خوب نفع کمایا۔ ایسا موقعہ ملتے ہی یہ پھر بھی اپنی مطلب براری سے باز نہ

آئینگے مصیبت کے وقت کھادی سے کپڑے کی کمی کچھ حد تک پوری ہو سکتی ہے۔ اور عوام نقصان اٹھانے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کھادی کے پرچار کی مناسبت بہت کچھ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ کھادی تیار کرنے کا طریقہ بے وقت ہے اور کھادی سے نہ تو ملکی سرمایہ میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی عوام کے معیار زندگی میں ترقی ہو سکتی ہے۔ اس لئے میری رائے میں بڑے بڑے کارخانوں کا اجرا ضروری ہے۔ کھادی کی وجہ سے ان کارخانوں کو کوئی رکاوٹ بھی محسوس نہ ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں بڑے بڑے کارخانے ایک ہی شخص یا مجموعہ افراد کے قبضہ میں نہ رہیں۔ بجلی کی طاقت نے پچھلے تین سال میں دنیا کی تجارت کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اور اس کے مزید ترقی کرنے کا پورا امکان ہے۔

آخر میں میں باضر کے مضمون نویس کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں چاہتا۔ کہ انگلینڈ کا گلا گھونٹا جائے۔ و انگلینڈ والوں کے بہت سے اوصاف کا میں مداح ہوں۔ میرا یہ یقین ہے کہ انگلینڈ کی اکثریت آبادی چھوٹے چھوٹے مجموعہ افراد کے ذریعہ چوسی جاتی ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ برٹش شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا قدرتی طریقہ پر بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ اور میں اس میں امداد دینا چاہتا ہوں۔

GOVT GIRLS COLLEGE SRINAGAR ACC. NO 13413 LIBRARY

۶۔ سارا ہندوستان ایک ملک ہے

(لدھیانہ میں دیسی ریاستوں کی رعایا کی جو کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے صدر پنڈت جواہر لال جی نہرو تھے۔ اسی وقت کی یہ تقریر ہے)

کانگریس پوری طاقت سے ریاستی رعایا کا ساتھ دیگی

دیسی ریاستوں کی رعایا کا ہر سال جلسہ ہوا کرتا ہے۔ اور اس میں ریاستوں کے مسائل پر غور و خوض ہوتا ہے

اور ہر سال ریاستوں میں پھیلی ہوئی مطلق العنانی۔ بدانتظامی۔ بداخلاقی اور بیکسی کے خلاف آواز بلند ہوتی ہے۔ اس کانفرنس کی سعی اور کانگریس کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور آج دیسی ریاستوں میں بیداری دکھائی دیتی ہے۔ جب مستقبل میں ہندوستان کی تاریخ لکھی جائیگی تو ۱۹۳۸ء کا سال بیداری کا سال لکھا جائے گا۔ دور مستقبل کے تاریخ دان اس بیداری پر حیران نہ ہوں گے۔ مگر انہیں اس بات سے تعجب ضرور ہوگا۔ کہ جب تمام دنیا کا نظام حکومت بدل گیا۔ تب بھی ہندوستان میں نزاید ال دیسی ریاستوں کی رعایا پشت ہا پشت سے ناقابل برداشت مظالم اور بھیانک حالات کو کس طرح سہتی رہی۔

۱۹۳۸ء کی تاریخ لکھی جا چکی ہے۔ اور اب ہم ۱۹۳۹ء کی دہلیز پر ہیں۔ آزادی کی جنگ کا زور بڑھ رہا ہے اور تمام ہندوستان کی آنکھیں دیسی ریاستوں کی اس بڑی لڑائی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسے موقعہ پر آپ نے مجھے اپنی کانفرنس میں مدعو کیا ہے۔ اور آپ کا حکم مان کر میں حاضر بھی ہُوا ہوں۔ میں آپ کے پاس صرف اس لئے نہیں آیا۔ کہ میں دیسی ریاستوں کی رعایا کی آزادی کی زبردست خواہش رکھتا ہوں۔ بلکہ برٹش علاقہ کے نیک خیالات لیکر آیا ہوں۔ کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اس عہد کا پیغام دینے آیا ہوں۔

کانگریس کی پالیسی ؛ گذشتہ سالوں میں کتنے ہی اشخاص نے دیسی

ریاستوں کے متعلق کانگرس کی پالیسی پر طرح طرح کی بحث وتمحیص کی ہے۔ کانگرس دیسی ریاستوں کے مسائل میں حصہ لے یا الگ رہے۔ اس پر بہت سرگرمی سے اظہار خیال ہوا ہے۔ اب تمام بحث مباحثہ ختم ہو گیا ہے اور اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ پھر بھی دیسی ریاستوں کے متعلق کانگرس کی پالیسی نے موجودہ شکل کیسے اختیار کی۔ اس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ میں اس پالیسی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور کسی خاص مسئلہ پر زور دینے کے حق میں بھی نہیں تھا۔ مگر حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کانگرس کی یہ پالیسی درست تھی اور بعد کے واقعات نے اسے ٹھیک طور پر ثابت بھی کر دکھایا ہے۔ زبردست انقلاب یا تغیر و تبدل کی پالیسی ایسی ہونی چاہیئے جس میں صداقت ہو۔ اور وہ حالات کے مطابق بھی ہو۔ قدرتی حالات سے علیحدہ ہو کر سخت تقاریر اور زبردست قراردادیں اس فضا کو پیدا نہیں کر سکتیں جس میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ مصنوعی طریقہ سے بھی وہ حالات پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ اور اگر عوام تیار نہ ہوں۔ تو پبلک تحریک نہیں چلائی جا سکتی۔

کانگرس نے اس بات کو محسوس کیا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ دیسی ریاستوں کی پبلک تیار نہیں۔ اس لئے اس نے دیسی ریاستوں کے باہر ہی اپنی طاقت صرف کی۔ اس میں بھی شک نہیں۔ کہ دیسی ریاستوں کی رعایا پر اثر ڈالنے کا بھی یہ اچھا طریقہ تھا۔ تاکہ وہ اس جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔

ہری پورہ کی قرارداد

کانگرس کی پالیسی سے متعلق ہری پورہ کی قرارداد ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان کا

ناقابل تقسیم اور متحد ہونا ہی اس آزادی کا اولیں مقصد ہے جس کے لئے ہماری جنگ اور کوشش ہے۔ دیسی ریاستوں کو بھی وہی سیاسی مجلسی اور اقتصادی آزادی ملنی چاہیئے۔ جو برٹش علاقہ کو ملنی چاہیئے۔ اس بات کے علاوہ دوسری کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ کانگرس نے مکمل آزادی اور ریاستوں میں شہری آزادی کی گارنٹی کا پھر سے اعلان کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی اعلان کیا ہے۔ کہ مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے دیسی ریاستوں میں اسے کام کرنے کا پورا حق ہے۔ کانگرس اس میں مداخلت نہ کرے۔ یہ تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ کانگرس ہندوستانی عوام کی نمایندہ جماعت ہے۔ اس لئے ہندوستان اور اس کے عوام کے لئے کام کرنے کا میدان نہ ہی تو محدود ہے۔ اور نہ ہی اس کے آزادانہ طرز عمل میں کوئی رکاوٹ وہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں کہیں ہندوستان کی عزت کے لئے ضروری ہو۔ وہاں مداخلت کرنا کانگرس کا حق ہے اور فرض ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے۔ تو وہ اپنا فرض پورا نہیں کرتی۔ اور وہ جن کی نمایندگی کرتی ہے۔ اسے دھوکا دیتی ہے۔

کانگرس ناقابل تفریق ہے

اب کانگرس اور ہندوستانی عوام کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ وہ کہاں مداخلت کریں۔ اور کس پالیسی سے کام لیں۔ جس سے ان کی مداخلت موثر اور نتیجہ خیز ہو۔ اگر کوئی رکاوٹ ہے تو اسے بھی اس نے ہی پیدا کیا ہے یا بیرونی حالات کے پیش نظر یہ پابندی عاید کی گئی ہے۔ جسے تسلیم کرنا عقلمندی ہے۔ باہر کی کوئی بھی طاقت کانگرس کے طرز عمل پر اسی طرح پابندی عاید نہیں کر سکتی۔ جس طرح کوئی بیرونی طاقت ہندوستانیوں کی خواہشات

عظیم اور ترقی کو محدود نہیں بنا سکتی۔

کانگریس کو بخوبی معلوم ہے۔ کہ دیسی ریاستوں کا پیچھے رہنا ہماری سیاسی تحریک کی رفتار کے لیئے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اور جب تک دیسی ریاستوں میں بیداری نہ ہو۔ تب تک ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ کانگریس ایسے ضروری اور عظیم انقلاب کی خواہشمند تھی۔ مگر اسے ساتھ ہی یہ بھی معلوم تھا۔ کہ یہ تحریک تب کامیاب ہو گی۔ جب دیسی ریاستوں میں خودداری اتحاد اور کشمکش کے بوجھ کو خود اٹھانے کی طاقت پیدا ہو۔ کانگریس نے اسی پر زور دیا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ تو یہ دھوکا ہوتا اور غلط فہمیوں میں اضافہ ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ دیسی ریاستوں کے دیسے اتحاد میں دیر لگتی جن میں عوام کی خواہشات اور نمایندگان کا ذکر ہو۔

تمام ہندوستان کی جنگ

جب ہم ہری پور کانگریس کے بعد کی ترقی کو دیکھتے ہیں۔ تب آج کانگریس کی دوراندیشی واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ تمام ریاستوں میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ کتنی ہی ریاستوں میں پبلک تحاریک چل رہی ہیں۔ برٹش علاقہ کے ساتھ ہی ریاستی عوام بھی مقابلے میں آ رہے ہیں اور برٹش علاقہ کے عوام کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھ رہے ہیں۔ ان کی کشمکش سے ہماری قومی تحریک بہت زیادہ پُرزور ہو گئی ہے۔ اس لئے مختلف ریاستوں کی اس جدوجہد کو ٹھوس بنا کر برٹش ملوکیت پرستی کی بڑی کشمکش کا مقابلہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چاہے اس تحریک کی شکل مختلف ہو۔ اور ہماری لڑائی کے محاذ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر آزادی

کے لئے اب علیحدہ علیحدہ لڑائی نہیں لڑی جائے گی۔ جیسا کہ گاندھی جی نے کہا ہے۔ کہ جہاں کہیں بھی آزادی کی جنگ ہو۔ وہ تمام ہندوستان کی ہی سمجھی جانی چاہیئے۔

گاندھی جی کی رہنمائی

دیسی ریاستوں کے لئے خطرہ کا سخت نازک وقت آپہنچا ہے۔ اس لئے یہ عین مناسب ہُوا۔ کہ ہندوستان کے لیڈر جنہیں ہندوستان کی آزادی کی ہمیشہ فکر رہتی ہے۔ اور اس کی کوجا کے لئے آرزو مند تھے۔ اپنی پرانی آواز کے ساتھ آج سامنے آرہے ہیں۔ اس سے ہمارے اندر یقین اور حوصلہ پیدا ہوتے ہیں۔ گاندھی جی کی رہنمائی نے تمام بحث مباحثوں کو ختم کر دیا۔ اور فضول دلائل کو مٹا دیا۔ اب تو ہمارے سامنے واضح اور طے شدہ مسئلہ ہے۔

ہمارا مخالف کون ہے

ہندوستان میں تقریباً چھ سو دیسی ریاستیں ہیں۔ ان میں بڑی بھی ہیں۔ اور ایسی چھوٹی بھی جن کو نقشہ پر ظاہر کرنا بھی مشکل ہے۔ ان میں بھی سخت اختلاف ہے۔ کچھ نے صنعت و دستکاری میں اور تعلیمی پہلو سے خوب ترقی کی ہے اور کچھ میں قابل حکمران اور وزرا ہیں۔ ان میں زیادہ تر ناقابل اور مطلق العنانہ طاقتیں ہیں۔ جو کبھی کبھی گندے اور گرے ہوئے اشخاص کے ذریعے کام کرتی ہیں۔ مگر چاہے حکمران اچھا ہو یا بُرا۔ اور اس کے وزرا قابل ہوں یا ناقابل۔ ان کے طرز حکومت میں خرابیاں ہیں۔ دنیا سے اس قسم کا نظام سلطنت ختم ہو چکا ہے۔ مگر ہندوستان میں اب تک اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس سے بہت پہلے یہاں سے بھی اس کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ گو آہستہ آہستہ یہ ختم ہو رہی ہیں۔ اور وہ تقریباً مُردہ

ہیں۔ مگر برٹش شہنشاہیت نے سہارا دیکر بنادٹی طریقے سے انہیں زندہ رکھا ہے۔ یہ ہندوستان میں انگریزی طاقت کا نتیجہ ہیں جنہیں اپنی خود غرضی کے لئے ملوکیت پرستی دودھ پلاتی ہے۔ انقلاب عظیم نے تمام دنیا کو الٹ دیا ہے۔ تبدیل کر دیا ہے۔ سلطنتیں تہ و بالا ہوگئیں۔ حکمرانوں اور چھوٹے موٹے رئوسا کا بڑا حصہ ختم ہوگیا۔ مگر پھر بھی ہندوستان میں یہ زندہ ہیں۔ گو وہ بالکل بیجان سے ہیں۔ یہ صرف برٹش حکومت کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے ہندوستان میں دیسی حکمرانوں کا نظام حکومت برٹش ملوکیت پرستی کا ہی انجام اور بقیہ ہے۔ اس لئے جب کشمکش شروع ہو۔ تو ہمیں دیکھنا ہوگا۔ کہ اس کام میں ہمارا مخالف کون ہے۔

معاہدوں کی دلیل

اب ہمیں دیسی ریاستوں کی کہی جانیوالی آزادی اور خدائی طاقت کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کا تذکرہ سنائی دیتا ہے۔ جو بہت مقدس مانے جاتے ہیں۔ جن کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہینگے۔ ہم نے ابھی ان بین الاقوامی معاہدوں اور ان نہایت ہی مقدس وعدوں کی حالت دیکھی ہے جو ملوکیت پرستی کی اغراض پورا کرنے کے لئے نامناسب ہوتی ہیں۔ ہم نے انگلینڈ اور فرانس کی عہد شکنی۔ دوست احباب کے ساتھ غداری اور ان کو کمینہ طور پر چھوڑ دینا اور ان معاہدوں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس سے جمہوریت پسند اور آزادی چاہنے والوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اس لئے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مگر جب مطلق العنانہ حکومت اور ملوکیت پرستی کو دھکا لگنے کی نوبت آتی ہے

تب ان معاہدوں پر عمل کیا جانا ضروری بن جاتا ہے۔ چاہے یہ عوام کے لئے واضح طور نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی ان کی حفاظت ہونی ہی چاہیئے یہ دراصل بہت ہی بھیانک بات ہے کہ ہم ان معاہدوں پر عمل کئے جانے کے لئے مجبور کئے جائیں۔ جن کے متعلق نہ ہی تو عوام کی صلاح لی گئی۔ اور نہ ہی جن کے لئے رعایا نے تعاون کیا۔ عوام سے یہ امید رکھنا خام خیالی ہے۔ کہ وہ اپنے گلے میں فریب سے ڈالے ہوئے غلامی کے پھندے کو ہمیشہ پہنیں رہیں۔ اور اپنا خون چوسنے والے اصولوں کے پابند رہیں۔ ہم نہ تو ایسے معاہدوں کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ اور نہ ہی انہیں کسی حالت میں منظور کرنے کو ہی تیار ہیں۔ ہمارے خیال میں عوام کی رائے ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہی اس کی ہر طرح مستحق ہے۔ اور پبلک مفاد ہی سب سے زیادہ اہم شے ہے۔

آزادی کی پول

تھوڑے دنوں سے دیسی ریاستوں کی آزادی کا ایک نیا اصول گھڑ لیا گیا ہے۔ اس کی محرک وہی خدائی طاقت ہے جس نے ان دیسی ریاستوں کو اپنے فولادی پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس کی مناسبت نہ ہی تو تاریخی اور نہ ہی آئینی دفعات کے ذریعہ ثابت کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ان ریاستوں کی پیدائش کے متعلق تحقیقات کریں۔ تو ان کے بہت سے حکمران جاگیرداروں کے درجہ میں آ جائینگے۔ کیونکہ رواج اور اصول بالکل واضح ہیں۔ اس لئے ہمیں آئینی پڑتال کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ان ریاستوں کو مکمل طور پر غلام بنائے رکھنے کے لئے برٹش طاقت کے ذریعہ یہ رواج چلایا گیا ہے۔ اور اس طاقت کا معمولی اشارہ ہی ان ریاستوں کے لئے نص

حکم کے مطابق ہے۔ جس کی خلاف ورزی کرنا ان کے لئے خطرہ سے خالی نہیں۔ بھارت سرکار کا سیاسی محکمہ (پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ) تار کھینچتا ہے۔ اور یہ ریاستیں اس کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگتی ہیں۔ مقامی ریزیڈنٹ تو ان کا مکمل طور پر حاکم ہوتا ہی ہے۔ کچھ دنوں سے یہ رواج پڑ گیا ہے۔ کہ دیسی راجے اپنی ریاستوں کی وزارتیں انگریزی عہدہ داران کو سونپنے کے لئے مجبور کیے جائیں۔ اگر اسی کا نام آزادی ہے۔ تو اس بات کا مطالعہ بہت دلچسپ ہوگا۔ کہ ایسی آزادی اور سخت غلامی میں کیا فرق ہے؟

درحقیقت نہ تو یہ ریاستیں آزاد ہیں۔ اور نہ ہی مستقبل قریب میں ان کے آزاد ہونے کا کوئی امکان ہے۔ کیونکہ جغرافیائی نقطہ نظر سے یہ تقریباً ناممکن ہے۔ اور ساتھ ہی متحدہ ہندوستان کے خیال کے بھی یہ بالکل برعکس ہے۔ بڑی ریاستوں کے لئے یہ امر قابل غور اور ضروری ہے۔ کہ انہیں جہاں تک ممکن ہو ہندوستانی فیڈریشن (سنگھ) کے اندر ہی مقامی آزادی دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ہندوستان کا ناقابل تقسیم عضو بنا رہنا ہوگا۔ اور معمولی اغراض کے متعلقہ مضامین کا انتظام مرکزی حکومت کے ذریعہ ہی ہوگا جس کی شکل متحدہ جمہوریت جیسی ہونی چاہیئے۔ اندرونی معاملات میں انہیں ذمہ دارانہ حکومت کا انتظام کرنا ہوگا۔

رعیتوں کی غلامی

یہ صاف ہے کہ اگر کشمکش رعایا اور حکمران تک ہی محدود رہے۔ تو ان ریاستوں کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ زیادہ تر حکمران اگر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے

لئے آزاد کر دیئے جائیں۔ تو وہ اپنی رعایا کے ساتھ تعاون کرینگے۔ اگر ان میں سے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرینگے۔ تو رعایا کے دباؤ سے انہیں بھی جلد ہی اپنے خیالات میں تبدیلی لانی پڑیگی۔ ایسا نہ کرنا ان کی حالت کو خطرہ میں ڈال دیگا۔ اس کی دوسری شکل ان کی ہستی ہی ختم کئے جانے کی ہوگی

کانگریس اور مختلف پرجا منڈلوں نے اب تک اس بات کے لئے ہر طرح کی سعی کی ہے۔ کہ رئیس اپنی رعایا کے ساتھ تعاون کریں۔ اور ذمہ دارانہ حکومت قائم کریں۔ رئیسوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ان کے اس بات کو منظور نہ کرنے سے ان کی رعایا کو آزادی حاصل کرنے سے روکا نہ جا سکیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ حکمران اور رعایا کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج واقع ہو جائے گی۔ اور ان دونوں کو آپس میں ملانا مشکل ہو جائیگا۔ گذشتہ سو سال میں دنیا کا نقشہ بہت دفعہ بدل چکا ہے۔ بہت سی سلطنتیں ختم ہو گئیں۔ اور نئے نئے ممالک پیدا ہو گئے۔ آج کل بھی ہم اپنی آنکھوں سے نقشے کو بدلتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ کہنے کے لئے کسی پیشگوئی کرنے والے کی ضرورت نہیں۔ کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی موجودہ حالت کا خاتمہ ہو جانا یقینی ہے۔ اور یہی بات اب تک ان کی حفاظت کرنے والی برٹش حکومت کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ رئیسوں کے لئے عقلمندی کا راستہ یہی ہے۔ کہ وہ رعایا کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ اور نئی آزادی میں رعایا کے ساتھ ساتھ وہ بھی برابر کے حصہ دار بنیں۔ اس طرح مطلق العنان اور غیر ہر دلعزیز رئیس ہونے کی جگہ عظیم قومی اجتماع کے ممبر بنیں اور اس پوزیشن پر فخر کرتے ہوئے برابر کے حقوق رکھنے والے شہری ہوں۔

کچھ ریاستوں کے رؤسا نے اس بات کو محسوس کیا۔ اور وہ مناسب اقدامات کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمران مہاراجہ اوندھ ہیں جنہوں نے اپنی رعایا کو نیک خیالات اور فیاضی کے زیر اثر ذمہ دارانہ حکومت دے کر اپنی عقلمندی اور اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔

زوال پذیر جماعت

مگر بدقسمتی سے دیسی ریاستوں کے رؤسا میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جو اپنی پرانی پالیسی سے ہی چمٹے بیٹھے ہیں۔ اور ان میں تبدیلی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ وہ اس تاریخی تعلیم کی صداقت کا ثبوت دے رہے ہیں کہ جب ایک طبقہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے۔ اور دنیا کو اس کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی عقل اور طاقت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہیں چل سکتے۔ جو چیز آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ اسے پکڑ رکھنے کی فضول کوشش میں وہ اس چیز سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جو اس کے برعکس عمل کرنے سے ان کو مل سکتی تھی برٹش حکومت نے بہت عرصہ تک اپنے انتظام کی خوبیوں کا ثبوت دیا۔ تمام انیسویں صدی اور اس کے بعد بھی اس نے دنیا پر اپنی حکومت قائم رکھی۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ہمت۔ طاقت اور دور اندیشی سے خالی ہو رہی ہے۔ اور عملی کام اور خیالات کے بالکل ناقابل بن گئی ہے وہ اپنی کچھ اغراض کی حفاظت کے لئے بدحواسی کے ساتھ کوشش کرتی ہوئی دنیا میں اپنے اونچے درجہ کو ختم کر رہی ہے۔ اور حکومت کے قصر عالیشان کو گرا رہی ہے۔ یہی حال ان جماعتوں کا ہوتا ہے۔ جو اپنا کام پورا کر چکی ہیں

اور جن کی خوبیاں ختم ہو چکی ہیں۔ جب برٹش حاکموں کی جماعت ہی اپنی شان روایات کہن اور تعلیم کی موجودگی میں بری طرح ناکامیاب ہو رہی ہے۔ تو پھر ہم اپنے دیسی رئیسوں کے بارہ میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ تو کئی پشتوں سے سیاسی تنزل اور غیر ذمہ داری کے درمیان پرورش پاتے آ رہے ہیں آئین سلطنت کی گتھیاں سلجھانے کے لئے پولو کے گھوڑے کا انتظام کرنے۔ کتوں کی کسی خاص جماعت کو پالنے یا بیشمار خونخوار جانوروں کو مار ڈالنے کی اہلیت سے زیادہ علم اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر ریاستوں کے حکمران اس کے لئے تیار ہو جائیں تو وہ زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ان کی قسمت کی باگ ڈور برٹش حکومت کے ایجنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اسے ناخوش کر دیں۔ راجکوٹ کے معاملہ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ کس طرح ایک رئیس کو جو رعایا کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار تھا۔ ریاست سے علیحدہ کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اور کس طرح برٹش حکومت کے ایجنٹ کے دباؤ کے زیر اثر وہ قول شکنی کرنے پر مجبور ہوا۔

انگریزی حاکموں کو انتباہ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ریاستوں میں جو جدوجہد شروع ہے۔ وہ الٹے طریقے سے نؤ سا کے ساتھ ہے۔ در اصل تو وہ انگریزی شہنشاہیت سے ٹکر ہے یہ بالکل واضح اور فیصلہ شدہ ہے۔ اور یہی باعث ہے۔ کہ ریاستوں میں رعایا کے خلاف انگریزی طاقت کی مداخلت ایک خاص معنے رکھتی ہے ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ یہ مداخلت دن بدن ترقی پر ہے۔ نہ صرف انگریزی حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ۔ اور اس کے ایجنٹوں اور ریزیڈنٹوں کے

ذریعہ ہی نہیں۔ اس کی ہتھیار بند طاقت کے ذریعہ بھی جس کی ایک مثال
اڑیسہ ہے۔ یہ مداخلت جو پبلک تحریک کو کچلنے کے لئے کی جا رہی ہے۔
ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اگر انگریزی حکومت عوام کو دبانے
کے معاملہ میں مداخلت کریگی تو کانگریس بھی اپنی پوری طاقت کے
ساتھ اس معاملہ میں ضرور ہی دخل دے گی۔ ہمارے طریقے ان سے
بالکل مختلف ہیں۔ وہ عدم تشدد پر مبنی ہیں۔ مگر گذشتہ دنوں میں
ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ وہ کس قدر موثر ہیں۔

گاندھی جی نے اس کشمکش کے عالمگیر اثرات کے متعلق انگریزی
حکومت اور ہندوستان میں مقیم اس کے ایجنٹوں کو بار بار پیغام دیا
ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ کشمکش کسی خاص ریاست تک ہی محدود رہے
اور ساتھ ہی کانگریس کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کہ انگریزی عہدیداران
کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے صوبائی حکومتوں کو چلائیں۔ اگر زبردست
کشمکش ہوگی۔ تو اس کا اثر ہندوستان کے کونے کونے میں دور سے دور
تک پھیلے گا۔ اور سوال صرف ایک ریاست تک محدود نہ رہیگا۔
بلکہ انگریزی حکومت کو بالکل دور کر دینے کا ہوگا۔

موجودہ سوال اس وقت جدوجہد کی شکل کیا ہے۔ اس کو واضح
طور پر ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ برائے نام
اختلاف ہونے پر بھی تمام ریاستوں میں پورے ذمہ دارانہ آئین کا
مطالبہ ہے۔ پھر بھی یہ کشمکش اس وقت اس مطالبہ پر زور نہیں
دیتی بلکہ اس مطالبے کے لئے لوگوں کے متحد ہونے کے حقوق کو قائم
کرنا چاہتی ہے۔ جب ان حقوق سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اور شہری اختیارات

کچلے جا رہے ہیں۔ تب لوگوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ کہ اس طریقے سے تحریک چلائیں۔ جس کو آئینی طریقہ کہا جاتا ہے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ جن میں سے ایک کو منتخب کرنا ہے۔ یا تو شکست قبول کریں۔ اور تمام سیاسی امور یہاں تک کہ عوام کے معاملات بھی چھوڑ دیئے جائیں۔ اور اپنے ضمیر کی موت اور مسلسل مظالم برداشت کریں۔ جو انہیں کچلنے کے لئے ہیں یا پھر علانیہ مخالفت کریں یہ مخالفت ہمارے آئین کے مطابق مکمل عدم تشدد پر مبنی ہے۔ اگرچہ اور تشدد اور خرابی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے انکار کرنا ہے۔ انجام چاہے کچھ ہو۔ اس طرح اس وقت کا سوال زیادہ تر ریاستوں میں شہری حقوق یا آزادی کا ہے۔ گو تمام جگہ بنیادی مقصد ذمہ دارانہ حکومت ہے۔ جے پور میں یہ سوال ایک طرح سے اور بھی محدود ہے وہاں کی ریاستی حکومت پرجا منڈل کو تحفظ میں امداد دینے سے روک رہی ہے۔

برٹش حکومت کے اراکین اپنی بین الاقوامی پالیسی کی اہمیت سمجھتے ہوئے ہم سے اکثر اپنی امن پسندی کی باتیں کہتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ ان کو بین الاقوامی یا ملکی مسائل کو حل کرنے میں تشدد کے استعمال سے نفرت ہے۔ امن اور صلح کے نام پر انہوں نے بہت ہی رذیل بین الاقوامی چالبازی اور غلامی کو مدد دی ہے۔ اور یورپ کی جمہوریت اور آزادی کو ضرب کاری لگائی ہے۔ انہوں نے اپنی پالیسی کے ذریعہ یورپ میں عریاں تشدد کی حکومت قائم کر دی ہے۔ اور اس وقت سب سے بڑے غم انگیز سانحہ کے وقوع پذیر ہونے میں امدادی بنے ہیں۔ وہ

ہے سپین کی جمہوریت کی شکست۔ اس جمہوریت کی جس نے اتنے دنوں تک بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اتنی بہادری سے جنگ کیا۔ پھر بھی برطانیہ کے یہ سیاستدان امن پسندانہ سمجھوتوں کی دوہائی دیتے ہیں۔ اور طاقت کے استعمال اور تشدد کی برائی بتلاتے ہیں۔ وہ لوگ یورپ میں ان نیک جذبات کی اشاعت اس لئے کرتے ہیں کہ تشدد کی پیرو کار طاقتوں کو کھلے طور پر کام کرنے اور آزادی کو کچلنے کا کافی موقعہ ملے۔

ہم لوگ ہندوستان میں اور خاص کر دیسی ریاستوں میں کیا دیکھتے ہیں ہم پرامن اشاعت سے باہمی اتفاق اور فیصلہ کی جس قدر کوششیں کرتے ہیں۔ ان سب کی مخالفت برٹش حکومت کی ہتھیار بند طاقت اور سیاسی اثر کے ذریعہ پرورش پاتے ہوئے ریاستی افسران حیوانی طاقت سے کرتے ہیں۔ اس طرح جہاں جمہوریت اور آزادی کی طرف لے جانے والا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہاں تو بالکل جائز مطالبات اور پرامن طریقوں پر عمل کرنے کے باوجود بھی بے رحمی سے تشدد کے ذریعہ کچلا جاتا ہے۔ مگر جہاں فسطائیت اور شہنشاہیت اپنی اغراض سے جمہوریت اور آزادی کو کچلنے کے لئے تدبیریں چلاتے ہیں وہاں تشدد اور طاقت کے استعمال کو یہ کھلی چھٹی دیدی جاتی ہے۔ اور امن کی پالیسی صرف ان لوگوں کو روکنے اور مداخلت کرنے کے لئے ہے جو اپنی آزادی کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اس وقت بھی کوئی ایسا سمجھتا ہے کہ ظلم مطلق العنانی اور نکمے نظام سلطنت کا ریاستوں میں زیادہ دیر تک بالکل بحال رہیگا۔ کیا اس بات

سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ کہ یہ سب باتیں ضرور ختم ہو جائینگی اور آزاد اداریے ان کی جگہ لیں گے۔ ایسا ہے تو پھر کس طرح بغیر لڑائی جھگڑے کے یہ تبدیلی ہو سکتی ہے۔ جب تک کہ لوگوں کو پُرامن اتحاد اور سنجیدہ اور خوددار جمہوریت کے ارتقا کو پوری پوری سہولیات نہ دی جائیں کسی بھی طرح سے ترقی کے لئے سب سے پہلی ضروری بات یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے پورے پورے شہری حقوق دیئے جائیں۔ ہندوستان سے یہ کہنا اس کی ہتک کرنا ہے۔ کہ ریاستوں میں آرڈی ننسوں کا راج ہو۔ لوگوں کی جتھے بندی کی آزادی کچلی جائے۔ رعایا کے ساتھ غلامانہ سلوک کیا جائے اور وہ خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کرتے رہیں۔ کیا ریاستوں کو ہمیشہ اسی طرح بڑے بڑے جیلخانے ہی بنائے رکھنا ہے۔ جہاں انسانی جذبات کا گلا گھونٹ دینا ہی فرض عین سمجھا جاتا ہے۔ جہاں رعایا کی کمائی ٹھوس ٹھوس کر درباروں کی شان و شوکت بڑھانے۔ ظاہرداری اور عیش و عشرت کے کام میں لائی جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے میں بیشمار لوگ فاقہ سے مرتے ہیں۔ اور ان پڑھ اور بیوقوف بنے رہتے ہیں۔ کیا انگریزی ملوکیت پرستی کے سایہ میں اب بھی ہندوستان میں قرون وسطی کے حالات کو قائم رکھنا مناسب ہے۔

شعاع امید

نہ ہی تو ہم اور نہ ہی دُنیا میں اور کوئی مستقبل کا آرام دہ خواب دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ حال تکلیف اور آفتوں سے بھرا ہُوا ہے اور دنیا کا مستقبل تاریکی کے سیاہ پردے میں لپٹا ہُوا ہے۔ پھر بھی ہندوستان میں امید کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔ اگرچہ تاریک بادل ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ ان کرنوں میں حال ہی

میں جاگی ہوئی ریاستی رعایا کی طرف سے ہنوز کرنیں آ رہی ہیں۔ ہم اس تحریک کا بوجھ اٹھانے کی جرأت کر رہے ہیں۔ تو اپنے اوپر بہت بڑی ذمہ داری عاید کر رہے ہیں اور اس کو دیانتداری سے نبھانے میں ہمیں اپنی ساری ہمت اور علم صرف کر دینا ہو گا۔ بڑی بڑی باتیں کرنے سے کوئی کام نہ ہو گا۔ یہ تو کمزوری کی ایک نشانی ہے اور کام میں روکاوٹ ڈالنے والی چیز ہے آج سب سے بڑی ضرورت کام کرنے کی ہے۔ عقلمندانہ اور مؤثر کام کرنے کی۔ جس سے بہت جلد ہم اپنے مقصد تک پہنچ سکیں۔ مخالف طاقتوں پر فتح حاصل کر سکیں۔ اور جس متحدہ ہندوستان کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس کی تعمیر کر سکیں۔

ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ مفاد اور سہولیات ہمیں اپنی طرف کشش کریں۔ اگر وہ ہمارے مقصد کی تکمیل کے راستے میں روکاوٹ ہوں۔ تو انہیں ٹھکرا دینا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ عارضی جوش کے زیر اثر ہم اپنے اصولوں سے منحرف ہو جائیں۔ مگر ایسا کرنا ہمارے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو گا۔ ہمارا مقصد بہت ارفع ہے۔ اس لئے ہمارے ذرائع بھی اونچے ہونے چاہئیں۔ جس بلند درجہ کی ہم خواہش کر رہے ہیں۔ اس کے حصول کرنے کی اہلیت بھی تو ہمیں اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ نااہل رہ کر ہم کبھی اونچے مقصد کے حصول کے قابل نہ ہو سکیں گے۔

ریاستی رعایا کی آزادی بہت بڑی شے ہے۔ پھر بھی وہ کل تمام ہندوستان کی آزادی کا ایک حصہ ہی ہے۔ اور جب تک ہم تمام ملک کو آزاد نہیں کرا لیتے۔ ہمیں جدوجہد جاری رکھنی ہو گی۔ اگر فیڈریشن زبردستی نافذ کیا گیا۔ تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔ اور اسے ختم کر کے چھوڑیں گے۔

جہاں کہیں بھی ہم انگریزی طاقت کو ریاستی عوام کے خلاف مداخلت کرتے دیکھیں گے۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ وقت آرہا ہے۔ جب ہم اس مسئلہ کو آئین ساز کمیٹی کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے حل کر دینگے۔ یہ کانفرنس تمام ہندوستانی عوام کی نمائندہ ہوگی اور آزاد ہندوستانی جمہوریت کا آئین بنائے گی۔

پرجا پریشد کے فرائض

گذشتہ دنوں میں دیسی ریاستوں کی پرجا پریشد نے اچھا کام کیا ہے مگر وہ اس کار عظیم کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ جو در اصل وہ سر انجام دے سکتی تھی۔ اب اسے اپنی تمام طاقت تمام امور کو منظم کرنے کی طرف لگا دینی چاہیئے۔ جس سے وہ ریاستوں سے متعلقہ تمام کاموں کا انتظام کر سکے۔ اور اس تحریک میں حصہ لینے والے تمام لوگوں کے لئے امداد اور سرگرمی کا ذریعہ بن سکے۔ اسے ریاستوں میں پرجا منڈل یا پرجا سنگھ بنانے میں مدد دینی چاہیئے۔ اسے اس بات کی پوری احتیاط رکھنی چاہیئے۔ کہ کوئی بھی فرقہ دارانہ جذبہ اس میں داخل نہ ہونے پائے۔ اسے خود بھی اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی یاد دہانی کرواتے رہنا چاہیئے کہ عدم تشدد اس تحریک کا بنیادی اصول ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ کانگرس ہمارے ساتھ ہے۔ اور اس کے لیڈر ہمارے ہمنیال ہیں۔ سب سے بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے۔ کہ ہمیں راستہ دکھانے اور سرگرم بنانے کے لئے مہاتما گاندھی ہمارے ساتھ ہیں۔

مہاتما گاندھی

ستیاگرہ تحریک کا پیغام

عدم تشدد اور تجدید (ریحریہ) کی اہمیت

ایک کانگرس لیڈر نے بات چیت کے سلسلہ میں مجھ سے کہا۔ "یہ کیا بات کہ کانگرس اب سیاست کے نقطہ نظر سے دلیسی نہیں رہی۔ جیسی کہ وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک تھی؟ تب سے اس کا سیاسی تنزل ہوا ہے۔ اس وقت اس کے نوے فیصدی ممبر کانگرس کے آئین کی پابندی نہیں کرتے۔ کیا آپ ان حالات کی اصلاح کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟"

یہ سوال مناسب اور حالات زمانہ کے مطابق ہے۔ میں یہ کہکر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کہ میں اب کانگرس میں نہیں ہوں۔ میں تو اس کی زیادہ خدمت کرنے کے لئے ہی اس سے الگ ہٹا ہوں۔ کانگرس کی پالیسی کو اب بھی میں متاثر کر رہا ہوں۔ یہ میں بخوبی جانتا ہوں۔ اور ۱۹۲۰ء میں کانگرس کا جو آئین تھا۔ اسے بنانے والے کی حیثیت سے اس گراوٹ کے لئے مجھے اپنے آپ کو ذمہ دار ماننا ہی پڑیگا۔ جس سے کم بجا جا سکتا ہے کانگرس نے ابتدائی مشکلات کے درمیان ۱۹۲۰ء میں کام شروع کیا تھا۔ صداقت اور عدم تشدد پر نصب العین کے طور پر بہت کم لوگ

یقین رکھتے تھے۔ زیادہ ممبران نے انہیں پالیسی کے اعتبار سے ہی منظور کیا وہ لازمی تھا۔ مجھے امید تھی کہ نئی پالیسی سے کانگرس کو کام کرتے ہوئے دیکھ ان میں سے بہت سے انہیں اپنے مقاصد کی شکل میں منظور کر لیں گے۔ مگر ایسا بہت کم لوگوں نے کیا۔ بہت نے ایسا نہیں کیا۔ ابتدا میں تو سب سے بڑے رہنماؤں میں زبردست انقلاب دیکھنے میں آیا۔ مرحوم پنڈت موتی لال نہرو اور رویش بندھو داس کے جو خطوط "ینگ انڈیا" میں ماخوذ کئے گئے تھے۔ انہیں ناظرین بھولے نہ ہونگے۔ خود ضبطی۔ سادگی اور قربانی کی زندگی میں انہیں ایک نئے لطف اور ایک نئی اُمید کا احساس ہُوا تھا۔ علی برادران تو تقریباً فقیر ہی بن گئے تھے۔ جگہ جگہ دورہ کرتے ہوئے ان بھائیوں میں ہونیوالی تبدیلی کو میں خوشی سے دیکھتا تھا۔ اور جو بات ان چار لیڈروں سے متعلق سچ ہے۔ وہی اور بہت کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے۔ جن کے میں نام گنوا سکتا ہوں۔ ان لیڈروں کی سرگرمی کا عوام پر بھی اثر ہُوا۔

ایک سال میں سوراجیہ کی کشش

لیکن یہ ظاہرا تبدیلی" ایک سال میں سوراجیہ کی کشش کا نتیجہ تھی۔ اس کی تکمیل کے لئے میں نے جو شرائط وضع کی تھیں۔ ان کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ خواجہ عبدالمجید صاحب نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ ستیاگرہ فوج کے جیسی کہ کانگرس اس وقت بن گئی تھی۔ اور ابھی بھی ہے داگر کانگرسی ستیاگرہ کے مطلب کو سمجھیں) فوجی لیڈر کی حیثیت سے مجھے یہ بات طے کر لینی چاہیئے تھی۔ کہ میں جو شرائط عائد کر رہا ہوں۔ وہ قابل عمل بھی ہیں یا نہیں۔ شائد ان کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ صرف میرے پاس وہ علمی آنکھ نہ تھی۔ بحیثیت مجموعی اور سیاسی نقطہ نظر سے عدم تشدد کا استعمال

خود میرے لئے بھی ایک تجربہ ہی تھا۔ اس لئے میں فخریہ انداز سے کوئی دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ میری شرائط کا یہ مقصد تھا۔ کہ لوگوں کی طاقت کا اندازہ ہو سکے۔ وہ پوری ہو بھی سکتی تھیں، اور نہیں بھی ہو سکتی تھیں۔ غلطیوں اور غلط اندازوں کا تو ہمیشہ ہی امکان تھا۔ جو بھی ہو۔ جب آزادی کی جنگ طویل ہو گئی۔ اور خلافت کے سوال میں جان باقی نہ رہی تو لوگوں کا جوش سرد پڑنے لگا۔ اور جھوٹ داخل ہو گیا۔ جن لوگوں کا ان دونوں اوصاف میں یا کھدر کی شرطیں کوئی یقین نہ تھا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ اور بہت نے تو علانیہ کانگرس کے آئین کی خلاف ورزی کرنی شروع کر دی۔

یہ خرابی ترقی کرتی گئی۔ ورکنگ کمیٹی کانگرس کو اس برائی سے صاف کرنے کی کچھ کوشش کرتی رہی۔ مگر مستقل مزاجی سے نہیں۔ اور نہ ہی کانگرس کے ممبران کی تعداد کم ہو جانے کے خطرہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو سکی ہے۔ میں خود تو تعداد کی بجائے جوہر میں ہی زیادہ یقین رکھتا ہوں۔

لیکن عدم تشدد کی سکیم میں زبردستی کا کوئی کام نہیں ہے۔ اس میں تو اسی بات پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ کہ لوگوں کی عقل اور دل تک۔ اس میں بھی عقل کی بجائے دل تک زیادہ پہنچنے کی قابلیت حاصل کی جائے۔

ستیاگرہ کے جرنیل میں طاقت

اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ ستیاگرہ کے جرنیل کے الفاظ میں طاقت ہونی چاہیئے۔ وہ طاقت نہیں جو بیشمار ہتھیاروں سے حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ جو زندگی کی پاکیزگی۔ مستقل بیداری اور سچے عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجدید (برہمچریہ) پر عمل کئے بغیر حاصل ہونی ناممکن ہے اس کا اتنا مکمل ہونا ضروری ہے۔ جتنا کہ انسان کے لئے ممکن ہے۔ برہمچریہ

کا مطلب یہاں صرف جسمانی خود ضبطی ہی سے نہیں ہے۔ اس کا اس سے زیادہ مطلب ہے۔ اس کا مطلب ہے تمام حواس پر مکمل قابو۔ گندے خیالات بھی برہمچریہ کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اور یہی حال غصہ کا ہے۔ تمام طاقت منی (ویریہ) کی حفاظت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر اس طاقت کو ضائع کرنے کی بجائے جمع کیا جائے۔ تو یہ سب سے عمدہ قوت تخلیق کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے بُرے۔ پراگندہ پریشان خیالات سے بھی خفیہ طریق پر مسلسل یہ طاقت ضائع ہوتی رہتی ہے۔ اور چونکہ خیالات ہی تمام اعمال کی بنیاد ہیں۔ اس لئے وہ بھی اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی لئے مکمل طور پر منظم خیال بہترین قسم کی طاقت ہے اور خود ہی عمل میں بھی آسکتا ہے۔ خاموشی سے کی جانے والی دُعا کا مجھے تو یہی مطلب معلوم ہوتا ہے۔ اگر انسان ایشور کی مورتی کا پجاری ہے۔ تو اُسے محدود دائیرہ عمل کے اندر کسی خواہش کرنے کی دیر ہے۔ جیسا وہ چاہتا ہے۔ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ جس طرح چھونے سے بنے ہوئے نکلے ہیں، بھاپ رکھنے سے کوئی طاقت پیدا نہیں ہوتی اسی طرح جو اپنی طاقت کو کسی نہ کسی طریقے سے ضائع کرتا ہے۔ اس میں اس طاقت کا ہونا ناممکنات سے ہے۔ اولاد پیدا کرنے کے مقررہ مقصد کے علاوہ خواہشات نفسانی کے زیر اثر جنسی تعلقات اس طاقت کو ضائع کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے خاص طور پر اس کی جو مذمت کی گئی ہے۔ وہ بالکل درست ہے۔ لیکن جس نے عدم تشدد پر مبنی کام کے لئے انسانی جماعت کے مختلف حصوں کو منظم کرنا ہے۔ اُسے متذکرہ بالا تحریر کے مطابق مکمل خود ضبطی اور حواس پر قابو پانے کی پوری پوری

کوشش کرنی ہی چاہیئے۔

پرماتما کی مہربانی کے بغیر یہ مکمل خود ضبطی ممکن نہیں ہے۔ گیتا کے دوسرے ادھیائے (باب) میں ایک شلوک ہے۔

विषया विनिवर्तन्ते निराहारस्य देहिनः, रसवर्जं
रसोप्यस्य परं दृष्ट्वा निवर्तते ॥

یعنی جب تک فاقے کئے جاتے ہیں۔ تب تک حواس ادھر اُدھر نہیں دوڑتے۔ مگر صرف فاقہ سے رس خشک نہیں ہوتے۔ فاقہ کو ترک کرنے پر ان میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو قابو میں کرنے کے لئے تو ایشور کی دُعا ضروری ہے۔ یہ خود ضبطی عارضی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک دفعہ حاصل ہو جانے پر یہ کبھی تباہ نہیں ہوتی۔ اس حالت میں ویریہ شکتی (منی کی طاقت) اس طرح محفوظ رہتی ہے۔ کہ بیشمار راستوں میں سے کسی میں سے ہو کر اس کے کھلنے کا امکان بھی نہیں رہتا۔

کہا جاتا ہے کہ ایسا برہمچریہ (تجرد یار) اگر کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ غاروں میں رہنے والے ہی کر سکتے ہونگے۔ کہتے ہیں کہ برہمچاری (مجرّد) کو نو نہ ہی عورتوں کو چھونا چاہیئے۔ اور نہ ہی ان کے درشن کرنے چاہیئں۔ بلا شک کسی برہمچاری کو نفسانی خواہشات کے زیر اثر نہ تو کسی عورت کو چھونا چاہیئے۔ اور نہ ہی دیکھنا چاہیئے۔ اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ کہنا یا سوچنا چاہیئے۔ مگر برہمچریہ کے متعلق کتب میں ہمیں یہ تو ممانعت ملتی ہے۔ مگر اس کی اہم صفت نفسانیت کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے معاملات میں انسان غیر جانبدارانہ طریقے پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور اسی لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب اس پر اس تعلق کا

اثر پڑا اور کب نہیں۔ نفسانی خواہش اکثر بے خبری میں ہی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے دنیا میں آزادی سے سب کے ساتھ میل جول رکھنے پر برہمچریہ پر عمل کرنا مشکل ہے۔ مگر اس کے باوجود اگر دنیا سے تعلقات منقطع کر لینے سے ہی یہ حاصل ہو سکتا۔ تو اس کی کوئی خاص قیمت ہی نہیں رہ جاتی۔

دوسری عورتیں والدہ کی طرح

جیسے بھی ہو میں نے تیس سال سے بھی زیادہ زمانہ سے مختلف رجحانات کے درمیان رہتے ہوئے برہمچریہ کا کافی کامیاب تجربہ کیا ہے۔ برہمچریہ کی زندگی گذارنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ سلوک کو چھوڑ کر میرے بیرونی تعلقات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جنوبی افریقہ میں مجھے ہندوستانیو کے درمیان جو کام کرنا پڑا۔ اس میں میں عورتوں کے ساتھ آزادی سے ملتا جلتا تھا۔ ٹرانسوال اور نٹال میں شائد ہی کوئی ایسی ہندوستانی عورت ہو جس سے میں واقف نہیں۔ میرے لئے تو وہ سب بہنیں اور بیٹیاں ہی تھیں۔ میرا برہمچریہ کتابی نہیں۔ میں نے تو اپنے اور ان لوگوں کے لئے جو کہ میرے کہنے پر اس تجربہ میں شامل ہوئے۔ اپنے ہی اصول وضع کئے ہیں۔ اور اگر میں نے اس کے لئے مقررہ ممانعت پر بھی زیادہ سختی سے عمل نہیں کیا دھارمک کتابوں میں عورتوں کو تمام خرابیوں اور برائیوں اور کشش اور گراوٹ کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ مگر میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔ میں تو یہ مانتا ہوں۔ کہ مجھ میں جو خوبی ہے وہ سب میری ماں کی بدولت ہے۔ اس لئے عورتوں کو میں نے کبھی اس طرح نہیں دیکھا۔ کہ نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے ہی ان کو بنایا گیا ہے بلکہ اس کو عقیدت کے ساتھ دیکھا ہے جو کہ مجھے اپنی والدہ سے ہے۔ آدمی ہی ترغیب دے کر ان کو گرانے والا ہے

عورت کو چھونے سے وہ گندہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر وہ خود ہی اس کو چھونے
کے لائق صاف نہیں ہوتا۔ مگر حال ہی میں میرے دل میں یہ شک ضرور پیدا ہوا
ہے۔ کہ مرد اور عورت کے میل جول میں آنے پر ایک برہمچاری (مجرد) مرد
اور عورت کو کن اصولوں کی پیروی کرنی چاہیئے۔ میں نے جو شرائط مقرر کی ہیں وہ
مجھے کافی معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ کیا ہونی چاہئیں۔ یہ میں نہیں جانتا میں تو
تجربہ کر رہا ہوں۔ میں نے اس بات کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں اپنی تعریف کے
مطابق پورا برہمچاری بن گیا ہوں۔ اب بھی میں اپنے خیالات پر اتنا قابو
نہیں رکھ سکتا جتنی مجھے اہنسا کے عہد کی تکمیل کے لئے ضرورت ہے لیکن
اگر میری اہنسا ایسی ہو۔ جس کا دوسروں پر اثر پڑے۔ اور اسکی ان میں اشاعت
ہو۔ تو مجھے اپنے خیالات کو اس سے زیادہ منظم کرنا چاہیئے۔ اس مضمون
کے ابتدائی کلمات میں رہنمائی کی جس واضح ناکامیابی کا ذکر کیا گیا ہے
اس کی وجہ شاید کہیں نہ کہیں کسی کمی کا رہ جانا ہی ہے۔

اہنسا پر میرا اعتقاد ہمیشہ کی طرح مستقل ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین
ہے۔ کہ اس سے نہ صرف ہمارے ملک کی ہی ساری ضروریات پوری ہونی
چاہئیں۔ بلکہ اگر ٹھیک طریقے سے اس پر عمل کیا جائے۔ تو یہ اس خون
خرابے کو بھی روک سکتی ہے۔ جو ہندوستان کے باہر ہو رہا ہے۔ اور
ساری مغربی دنیا میں جس کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔

میری خواہش تو پابند شرائط ہے۔ پرماتما نے مجھے اتنی طاقت نہیں
دی ہے۔ جو اہنسا کے راستے پر ساری دنیا کی رہبری کروں۔ لیکن میں نے
یہ خیال ضرور رکھا ہے۔ کہ ہندوستان کی بہت سی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے
اہنسا کا استعمال کرنے کے لئے اس نے مجھے اپنا ذریعہ بنایا ہے۔ اس طرف

یں چل پڑا ہوں۔ یہ بہت عظیم کام ہے۔ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اتنے پر بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اس کے لئے عام طور پر کانگریسیوں کی جو ہمدردی ضروری ہے۔ اس کو اکسانے کی طاقت مجھ میں نہیں رہی ہے۔ جو اپنے ذرائع اور اوزاروں کو ہی بُرا بتاتا رہتا ہے۔ وہ کوئی اچھا بڑھئی نہیں ہے۔ یہ تو "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" والی مثال ہوگی۔ اسی طرح بگڑے ہوئے کاموں کے لئے اپنے آدمیوں کو قصوروار کہنے والا جرنیل بھی اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر میں یہ جانتا ہوں۔ کہ میں بُرا جرنیل نہیں ہوں۔ اپنی شرائط اور پابندیوں کو جاننے کی جتنی عقل مجھ میں ہے۔ اگر کسی وقت اس کا دیوالہ نہ نکل جائے تو ایشور مجھے اتنی طاقت دیگا۔ کہ میں اس کا واضح اعلان کر دوں گا۔

اس کی مہربانی سے میں کوئی نصف صدی سے جو کام کر رہا ہوں۔ اس کے لئے اگر میری مزید ضرورت نہ رہی۔ تو شاید وہ مجھے بلا لیگا۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ میرے کرنے کے لئے ابھی کام ہے۔ جو تاریکی میرے دل پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کافور ہو جائے گی۔ اور آزادانہ طریق پر اہنسا پر مبنی ذرائع سے ہندوستان اپنے مقصد کو حاصل کرے گا۔ اس کے لئے چاہے "ڈانڈی مارچ" سے بھی زیادہ سخت جنگ کرنا پڑے یا اس کے بغیر ہی ایسا ہو جائے۔ میں ایشور سے وہ روشنی مانگ رہا ہوں۔ جو تاریکی کو مٹا دے گی اہنسا میں جن کی زندہ عقیدت ہو۔ انہیں اس کام میں میرا ساتھ دینا چاہیئے۔

(اخبار "ہریجن" میں مہاتما گاندھی کا "اہنسا اور ہریجن" کے عنوان سے لکھا ہوا ایک مضمون)

GOVT. GIRLS COLLEGE
SRINAGAR
ACC. No 13913
LIBRARY

۲۔ ہنسا بنام اہنسا

ہندوستان میں آج جگہ بجگہ تشدد اور عدم تشدد کے طریقوں میں کشمکش ہو رہی ہے۔ عدم تشدد (اہنسا) تو پانی کے بہاؤ کی طرح ہے۔ پانی کو نکلنے کو راستہ ملتے ہی اس میں سے اس کا خوفناک بہاؤ بہنے لگتا ہے۔ اہنسا پاگل پن سے یا اندھے جوش سے کام نہیں کر سکتی۔ وہ تو تنظیم اور خود ضبطی کا نچوڑ ہے۔ مگر جب وہ عمل میں آتی ہے۔ تو پھر تشدد (ہنسا) کی کوئی بھی طاقت اسے زیر نہیں کر سکتی۔ اہنسا مکمل طور پر وہیں طلوع ہوتی ہے۔ جہاں اس کے رہنماؤں میں کندن جیسی صفائی اور غیر متزلزل اعتقاد ہو۔ اسلئے کشمکش میں اگر یہ ہارتی ہوئی معلوم دے۔ تو ایسا لیڈروں کی عقیدت کی کمی یا ان کی سچائی کم ہو جانے یا دونو وجوہات سے ہی ہوگا۔ یہ ہوتے ہوئے بھی آخر اہنسا ہی ہنسا پر فتحیاب ہوگی۔ یہ تسلیم کرنے کی وجوہات ہیں۔ جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں ان کا رخ ایسا ہے۔ کہ تشدد کی لغویت کو کارکنان خود ہی تسلیم کرینگے ایک مشہور کارکن نے لکھا ہے۔

"ستیاگرہ کا مقابلہ کرنے کا ریاستوں کا طریقہ برٹش علاقہ کے طریقے سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ کچھ ریاستوں میں جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں وہ بہت ہی حیوانی اور جابرانہ ہیں۔ ایسی حیوانیت کے سامنے کیا اہنسا کامیاب ہو سکیگی۔ عورتوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی بھی وہاں اجازت نہیں۔ عام قانون بھی ایسی حفاظت کی اجازت دیتا ہے۔ تو پھر جابرانہ اور حیوانیت پر مبنی حکومت کا مقابلہ کرنے میں یہ حق کیوں نہ کام

میں لایا جائے۔ ان سوالات پر کیا آپ روشنی ڈالیں گے؟

اڑلیسہ کے پولٹیکل ایجنٹ کے قتل کے متعلق آپ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ انہیں میں نے کئی بار پڑھا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اڑلیسہ کی دیسی ریاستوں کی رعایا پر جو مظالم ہوئے ہیں۔ ان کو آپ نے بیان نہیں کیا۔ ایجنٹ کا قتل کیا دیسی ریاستوں کے عہدیداران کو رحمدل بنانے کے لئے ایک خدائی اشارہ نہیں ہے۔ اگر دونو (دیسی ریاستوں کی رعایا اور پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ) کا مقابلہ کیا جائے۔ تو ان میں ہماری ہمدردی کا کون زیادہ حقدار ہے؟ اگر جم غفیر نے پولٹیکل ایجنٹ کے خلاف تشدد سے کام لینے میں غلطی کھائی۔ تو کیا پولٹیکل ایجنٹ کا گولی چلانا اور مجمع کو اشتعال دلانا مناسب تھا۔ اور جب بھیانک طریقہ عمل کے لئے پولٹیکل ایجنٹ ذمہ وار تھا۔ اس کے لئے آپ کیا کہیں گے؟ یہ درست ہے کہ پولٹیکل ایجنٹ کا قتل ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ مگر اس کے لئے کون جوابدہ ہے۔ اگر ایجنٹ نے اڑلیسہ کی دیسی ریاستوں کو مناسب مشورہ دیا ہوتا۔ اور تشدد کی پالیسی میں خود حصہ نہ لیا ہوتا۔ تو لوگ تابو سے باہر نہ ہوتے۔"

یہ واقعہ دیسی ریاستوں میں کام کرنیوالوں کے لئے ایک اشارہ سمجھا جانا چاہیئے۔ آپ کے اس خیال سے تو میں متفق ہوں۔ مگر ساتھ ہی سچائی اور اہنسا کے آپ جیسے عظیم واعظ نے انگریزی حکومت کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اور خاصکر مشرق کی دیسی ریاستوں کی ایجنسی کو بھی کیوں اشارہ نہیں کیا۔ کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کے سلوک کرنے میں ایسے وحشیانہ طریقے استعمال نہ کریں۔ ایجنسی کی کارروائی واقعی گھناؤنی ہے۔ اور پولٹیکل

ایجنٹ کا قتل ایجنسی کی حیوانی پالیسی کا ہی انجام ہے۔ یہ واقعہ افسوسناک ضرور ہے۔ مگر ایجنٹ اس کے لئے خود جوابدہ ہے۔ اور مجمع کے ذریعے قتل ہوئے ایجنٹ کے لئے اگر ہمدردی ظاہر کی جاتی ہے۔ تو اسی مقام پر جو دو آدمی (زیادہ پولیس کی زیادتیوں کی وجہ سے) مارے گئے۔ ان کے لئے ہمدردی کیوں نہ ظاہر کی جائے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایجنٹ بجلاگیٹ کا قتل سب سے پہلے تو انگریزی حکومت اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور دیسی ریاستوں کے لئے اور بعد میں ہمارے لئے بے حد سبق آموز ہے۔

بلا شک حفاظت خود اختیاری کا حق سب کو ہے۔ اور اسی طرح مسلح بغاوت کرنے کا حق بھی ہے۔ مگر عمیق طریقے پر سوچنے سے کانگرس نے دیدہ دانستہ دونو کو ہی ترک کر دیا ہے۔ اہنسا میں اگر زیادہ سے زیادہ اشتعال کے سامنے ڈٹے رہنے اور ریاست ہمت نہ ہونے کی طاقت نہ ہو۔ تو اس کی کوئی بہت بڑی قیمت نہیں رہ جاتی۔ شدید اشتعال کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کی طاقت ہی اس کی حقیقی کسوٹی ہے۔ عورتوں کی عصمت دری ہوتی ہو۔ اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اہنسا کے پیرو کار موقعہ پر موجود ہوں۔ تو وہ زندہ کہاں سے رہینگے؟ اور آبروریزی کے واقعات کا بعد میں علم ہو۔ تو پھر حیوانی طاقت کے استعمال کے کیا معنے؟ عدم تشدد کا طریقہ تو بعد میں بھی کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اس کے نتائج عوام کی رائے کے سامنے واضح طریق پر رکھے جا سکتے ہیں۔ مجرموں کو مشتعل ہجوم کے سامنے کر دینا تو حیوانیت ہی سمجھی جاتی ہے۔ ایجنٹ کے قتل سے متعلق دلیل اس وقت سامنے نہیں۔ مجھے ایک

طرف عہدیداران اور پولیٹکل ایجنٹ اور دوسری طرف لوگوں کی کارروائی
کی مناسبت کو ہمیں تولنا تھا۔ ایجنٹ کے قتل کی واضح الفاظ میں مذمت
کرنا اور وہ صرف ہمدردی کے خیال سے نہیں بلکہ کانگریس کے بنیادی
اصول سے انحراف کرنے اور خلاف قاعدہ فعل کے لئے۔ اتنا ہی
میرے لئے کافی تھا۔ رؤسا کی بداعمالیوں پر میں نے بری جن میں اکثر
روشنی ڈالی ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ لوگ ان پر غصہ اتاریں بلکہ لوگوں
کو یہ بتانے کے لئے ہی کہ وہ ان بداعمالیوں کا عدم تشدد سے کس طرح
مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اڑیسہ میں بہت اچھا کام چل رہا تھا۔ اس کا میں
کافی ثبوت دے سکتا ہوں۔ اس قتل نے وہاں کی تحریک میں جو ٹھیک
طور پر چل رہی تھی خلل ڈالدیا ہے۔ رن پور آج کل بھیانک جنگل بن
گیا ہے۔ بے قصور اور قصوروار تمام بھاگ کر ادھر ادھر چھپ رہے
ہیں۔ تشدد سے بچنے کے لئے وہ گھر بار چھوڑ کر دیہات کو ویران کرتے
جا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ بات تو ہے نہیں کہ صرف قصوروار ہی تشدد اور
سختی کی چکی میں پسینگے۔ کسی نہ کسی شکل میں وہاں دہشت پھیلائی جا رہی
ہے۔ اور تمام ہندوستان کو مجبور ہو کر آج یہ سب دیکھنا پڑ رہا ہے۔
با اختیار لوگ اپنے افسروں کی خصوصاً گورے افسروں کے قتل
ہونے پر کسی دوسرے طریقہ سے کام لینا جانتے ہی نہیں۔ نیا طریقہ معلوم
کرنے کے لئے تو عدم تشدد کے راستے کا انہیں آہستہ آہستہ سبق لینا ہے
مگر مجھے اپنی دلیل کو لمبا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کی کیا
ضرورت؟ دونوں ہی طریقوں کا آج ہندوستان میں تجربہ ہو رہا ہے۔
کارکنان کو دو میں سے ایک راستہ انتخاب کرنا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں۔

کہ ہندوستان صرف عدم تشدد کے ذریعہ سے ہی آزاد ہوگا. جو کارکن کانگریس میں رہ کر اس کے برعکس خیالات رکھتے ہیں یا اُلٹے طریقے سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اور کانگریس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۳۔ آزادی کیسے حاصل ہوگی؟

اہنسا اور ستیا گرہ کے اصولوں پر مکمل طور پر عمل کرنے سے

دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہ دینے کا جو فیصلہ کانگریس نے کیا تھا۔ اس کی مناسبت تازہ واقعات نے ثابت کر دی ہے کسی ریاست کا آئین حکومت چاہے کتنا ہی غیر منصفانہ۔ مطلق العنانہ اور غیر مناسب کیوں نہ ہو. مگر دراصل بات یہ ہے۔ کہ ہر ایک ریاست چھوٹی ہو یا بڑی (جہاں تک دوسری ریاستوں سے یا ملک کے اس حصہ سے اس کا تعلق ہے جو برٹش حکومت کہلاتا ہے) قانونی اور سیاسی نقطہ نظر سے ایک آزاد ہستی ہے. ہم لوگوں میں یکسانیت اس بات کی ہے. کہ ہم یکساں طور پر انگریزی حکومت کے آہنی پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر جغرافیائی اور قومی خیال سے دیسی ریاستوں کی رعایا اور ہندوستان کے دیگر حصوں کے لوگ. بالکل ایک ہیں۔ وہ دو حصوں میں تقسیم نہیں کئے جا سکتے. ہم تینتیس کروڑ مرد و زن کے جسم میں ایک ہی خون موجزن ہے۔ کوئی آئین حکومت یا کوئی فوجی پالیسی ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی ہمارا یہ قدرتی تعلق بغیر کسی خلل یا رکاوٹ کے برابر قائم ہے۔

طاقت کی آزمائش کا موقعہ

عدم مداخلت سے متعلق فیصلہ کے ذریعہ کانگرس نے دیسی ریاستوں کے لوگوں کو اپنی طاقت آزمانے کا موقعہ دیا ہے۔ یعنی ان کے اندر جو طاقت پنہاں ہے۔ اس سے کام لینے کے لئے انہیں ترغیب دی ہے۔ حال کے کچھ واقعات سے واضح ہوگیا ہے۔ کہ جب ایک دفعہ ان لوگوں کو اپنی طاقت کا علم ہوگیا۔ تب بغیر کسی قسم کی بیرونی امداد کے ہی انہوں نے اس کو استعمال کیا۔ اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دیسی ریاستوں کے افسران کو خود مجبور ہو کر اپنی رعایا اور اپنے درمیان اختلاف خیال دور کرنے کے لئے کانگرس والوں کی امداد لینی پڑی۔

اس میں شک نہیں کہ جو دیگر طریقے معلوم ہیں۔ انہیں کی طرح اس کا میدان بھی محدود ہے۔ کانگرس ایسی شرطیں پیش نہیں کر سکتی جو نامناسب ہوں۔ لوگوں کو جو شکایت ہو۔ وہ حقیقی ہونی چاہیئے۔ اور انہیں اسے دور کرنے کی کوشش میں صاف دلی سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ ستیاگرہ کا ہتھیار عدم تشدد پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ہمارا خیال انصاف پر قائم ہے۔ تو اس کی تائید کے لئے ہمیں اپنے مخالف کو تکلیف نہ پہنچاتے ہوئے خود تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اگر دیسی ریاستوں کی رعایا ستیاگرہ اور اہنسا کی طاقت کا پورا مطلب سمجھ جائے تو انہیں تمام ہندوستان کے اپنے حقوق حاصل کرنے سے پہلے ہی آزادی مل سکتی ہے۔ اس طرح انہیں انگریزی علاقہ کی الجھنوں میں پھنسے بغیر ہی عدم تشدد پر مبنی تقریریں کرنے مضمون لکھنے اور کام کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل

ہوسکتی ہے۔ وہ بغیر کسی خاص کوشش کے رؤسا کے ذاتی اخراجات کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اور کم خرچ میں حقیقی انصاف حاصل کرنے کی بات پختہ کروا سکتے ہیں۔ وہ نوکر شاہی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے انگریزی علاقہ کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے غربا کے مسئلہ اور دیہات سدھار کا حل نکال سکتے ہیں۔

یہی ان کا سوراجیہ ہوگا۔ حالانکہ کانگریس جو آزادی چاہتی ہے۔ اس سے یہ کم ہی ہوگا۔ اگر بڑی بڑی ریاستوں کی رعایا اپنی پوری طاقت سے کوشش کرے۔ تو مکمل آزادی اتنی جلدی مل سکتی ہے۔ کہ جس کا خواب میں بھی کبھی خیال نہ آیا ہو۔

اس لئے دیسی ریاستوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کرنیوالوں کو چاہیئے۔ کہ وہ بہت زیادہ بے چین نہ ہوں۔ انہیں اپنی محدود دیا بندیوں اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے اہنسا اور سچائی کی پوری طرح سے پیروی کرنے کی شرط کو نہ بھول جانا چاہیئے۔ انہیں ذرا بھی چوں چرا کئے بنا بندوق کی گولیاں سہنے کو تیار رہنا چاہیئے۔ اور حفاظت خود اختیاری کے لئے بھی ایک انگلی تک نہ اٹھانا چاہیئے۔

۴۔ اعلےٰ تعلیم

انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ہندوستان کا سخت نقصان۔ کالجوں کی ادبی تعلیم وقت اور طاقت کی خالص بربادی ہے۔	اعلےٰ تعلیم کے بارہ میں کچھ عرصہ کے لئے میں نے ڈرتے ڈرتے مختصر جو خیالات

ظاہر کئے تھے۔ ان پر میرے معزز دوست مشری نواس نے نکتہ چینی کی ہے جس کا انہیں پورا حق ہے۔ انسانیت۔ وطن دوستی اور علمیت کے لحاظ سے میرے دل میں ان کے لئے بہت عقیدت ہے۔ اس لئے جب میں اپنے تئیں ان سے خیالات میں مخالفت پاتا ہوں۔ تو میرے لئے ہمیشہ ہی افسوس کا مقام ہوتا ہے۔ اس پر بھی میرا فرض مجھے اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے بارہ میں میرے جو خیالات ہیں۔ انہیں میں پہلے سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر کر دوں جس سے مضمون پڑھنے والے خود ہی میرے اور ان کے خیالات کے اختلافات کو سمجھ لیں۔

اپنی کوتاہیوں کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے یونیورسٹی کی کوئی خاص اعلیٰ تعلیم نہیں پائی۔ میری سکول کی زندگی بھی اوسط درجہ کے طلباء سے زیادہ اچھی نہ تھی۔ میں تو یہی بہت سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح امتحان میں پاس ہو جاؤں۔ سکول میں خاص اعزاز حاصل کرنا تو ایسی بات تھی۔ جس کی میں نے کبھی خواہش بھی نہ کی تھی۔ مگر پھر بھی تعلیم کے بارہ میں جس میں کہ وہ تعلیم بھی شامل ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کہی جاتی ہے۔ عام طور پر میں پختہ خیالات رکھتا ہوں۔ اور ملک کے لئے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں۔ کہ میرے خیالات واضح طور پر سب کو معلوم ہو جائیں۔ اس کے لئے مجھے اپنی اس بزدلی یا ہچکچاہٹ کو چھوڑنا ہی پڑیگا۔ جو تقریباً خود ضبطی کی حدود تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے لئے نہ تو مجھے استہزا کا خوف کرنا چاہیئے نہ ہی ہر دلعزیزی یا عزت کے کم ہو جانے کی فکر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اگر میں اپنے عقیدے کو چھپا ڈالونگا۔ تو اس کے متعلق فیصلہ کرنے اور اپنی لغزشوں اور کمزوریوں کو کبھی درست نہ کر سکوں گا۔ لیکن میں تو ہمیشہ انہیں ڈھونڈنے اور اس

سے بھی زیادہ نہیں سُدھارنے کا آرزومند ہوں۔

اب میں اپنے ان تجربات کا نچوڑ بتا دوں۔ جن پر کہ میں کئی سالوں سے پہنچا ہُوا ہوں۔ اور جب کبھی موقعہ ملا ہے۔ ان کو عمل میں لانے کی کوشش کی ہے۔

(۱) دنیا میں حاصل ہو سکنے والی اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم کا میں مخالف نہیں ہوں (۲) حکومت کو جہاں بھی حسب حالات اس کی ضرورت ہو۔ اس کا خرچ برداشت کرنا چاہیئے (۳) معمولی آمدنی سے تمام اعلےٰ تعلیم کے اخراجات چلانے کے میں خلاف ہوں (۴) میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں ادب کی کتابی اور زبانی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بالکل فضول ہے۔ اس کا نتیجہ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن لڑکے لڑکیوں کو ہمارے کالجوں کی چکی میں بدقسمتی سے پسنے کا موقعہ ملا ہے۔ ان کی دماغی اور جسمانی صحت کو اس نے بالکل تباہ کر دیا ہے (۵) غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کے باعث، جس کے ذریعہ ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کو حد سے زیادہ دماغی اور سیاسی نقصان پہنچا ہے۔ ابھی ہم اس زمانہ کے اتنے نزدیک ہیں۔ کہ اس نقصان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور پھر ایسی تعلیم حاصل کرنے والے ہمیں کو اس کا شکار اور منصف دونوں ہی بننا ہے جو کہ ناممکن سا کام ہے۔

اب میرے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ میں ان نتائج پر کس طرح پہنچا۔ یہ شاید میں اپنے کچھ تجربات کے ذریعے ہی سب سے اچھی طرح بتا سکتا ہوں بارہ سال کی عمر تک میں نے جو تعلیم پائی۔ وہ اپنی مادری زبان گجراتی میں

تھی۔ اس وقت حساب۔ تاریخ اور جغرافیہ کا مجھے تھوڑا تھوڑا علم تھا۔ اس کے بعد میں ایک ہائی سکول میں داخل ہوا۔ اس میں بھی شروع کے تین سال تو مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم رہا۔ مگر سکول ماسٹر کا کام تو زبردستی طلبا کے دماغ میں انگریزی ٹھونسنا تھا۔ اس لئے ہمارا نصف سے زیادہ وقت انگریزی اور اس کے من مانے ہجوں اور تلفظ پر تا بولنے میں لگایا جاتا تھا۔ ایسی زبان کا پڑھنا ہمارے لئے ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔ اس کا تلفظ ٹھیک اس طرح نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ یہ لکھی جاتی ہے۔ ہجوں کو زبانی یاد کرنا ایک عجیب سا تجربہ تھا لیکن یہ تو میں یونہی سلسلہ کے لحاظ سے کہہ گیا۔ دراصل میری دلائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پہلے تین سال تو مقابلتاً اچھے ہی گذر گئے۔ خرابی چوتھے سال سے شروع ہوئی۔ الجبرا۔ کیمسٹری۔ تاریخ جغرافیہ وغیرہ ہر مضمون مادری زبان کی بجائے انگریزی میں ہی پڑھنا پڑا۔ جماعت میں اگر کوئی طالب علم گجراتی جسے کہ وہ سمجھتا تھا۔ بولتا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ ہاں انگریزی کو جسے نہ تو وہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ اور نہ صاف طور پر بول سکتا تھا۔ اگر وہ بری طرح تلفظ کرتا۔ تو بھی ماسٹر کو کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ ماسٹر بھلا اس بات کی فکر کیوں کرے؟ کیونکہ خود اس کی انگریزی ہی ٹھیک نہ تھی۔ اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کیونکہ انگریزی اس کے لئے اسی طرح غیر ملکی زبان تھی۔ جس طرح اس کے شاگردوں کے لئے۔ اس سے بہت گڑبڑ ہوتی تھی ہم طلبا کو بہت سی باتیں زبانی یاد کرنا پڑتیں۔ حالانکہ ہم انہیں پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو بالکل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ماسٹر کے ہمیں جیومیٹری سمجھانے کی مکمل کوشش کرنے پر بھی میرا سر گھومنے لگتا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ یوکلیڈ کی پہلی کتاب کی تیرھویں مشق تک جب تک ہم نہ پہنچے۔ میری سمجھ میں

جیومیٹری بالکل نہیں آئی۔ اور پڑھنے والوں کے سامنے مجھے یہ قبول کرنا ہی چاہیئے کہ مادری زبان سے محبت ہونے کے باوجود آج بھی میں یہ نہیں جانتا کہ الجبرا جیومیٹری وغیرہ کی اصطلاحی باتوں کو گجراتی میں کیا کہتے ہیں۔ ہاں یہ اب میں ضرور دیکھتا ہوں۔ کہ جتنا حساب۔ جیومیٹری۔ کیمسٹری اور جیوتش وغیرہ سیکھنے میں مجھے چار سال لگے۔ اگر انگریزی کی بجائے انہیں گجراتی کے ذریعہ پڑھا ہوتا۔ تو میں اتنا کچھ ایک ہی سال میں سیکھ لیتا۔ اس حالت میں میں آسانی اور صفائی کے ساتھ ان مضامین کو سمجھ لیتا۔ گجراتی کے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا ہوتا۔ اور اس علم کو میں نے اپنے گھر میں استعمال کیا ہوتا۔ لیکن ذریعہ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے میرے اور میرے خاندان کے لوگوں کے درمیان جو کہ انگریزی سکولوں میں نہیں پڑھتے تھے۔ ایک ناقابل عبور خلیج واقع ہو گئی۔ میں خواہش ہونے پر بھی اپنے والد کو اپنی پڑھائی میں دلچسپی لینے کی طرف راغب نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ عقل کی گو اُن میں کوئی کمی نہ تھی۔ مگر وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس طرح اپنے ہی گھر میں میں بڑی تیزی کے ساتھ اجنبی بنتا جا رہا تھا۔ یقیناً میں دوسروں سے اونچا آدمی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ میری پوشاک بھی اپنے آپ بدلنے لگی۔ لیکن میرا جو حال ہوا وہ کوئی غیر معمولی تجربہ نہ تھا۔ بلکہ اکثر کا یہی حال ہوتا ہے۔

ہائی سکول کے پہلے تین سالوں میں میرے عام علم میں بہت کم اضافہ ہوا یہ وقت تو لڑکوں کو ہر ایک چیز انگریزی کے ذریعہ سیکھنے کی تیاری کا تھا۔ ہائی سکول تو انگریزی کی تمدنی فتح کے لئے تھے۔ میرے سکول کے تین صد طلبا نے جو علم حاصل کیا۔ وہ تو ہمیں تک محدود رہا۔ وہ عوام تک پہنچانے کے لئے نہ تھا۔

انگریزی ادب کے مفاد

ایک دو لفظ ادب کے بارہ میں بھی۔ انگریزی نظم و نثر میں ہی ہمیں کئی کتابیں پڑھنی پڑی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب عمدہ ادب تھا۔ لیکن عوام کی خدمت یا ان کے تعلق میں آنے سے مجھے اس تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ میں نے انگریزی نثر و نظم نہ پڑھا ہوتا۔ تو میں ایک بیش قیمت خزانہ سے محروم رہ جاتا۔ اس کی بجائے سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ سات سال میں نے گجراتی پر قدرت حاصل کرنے میں لگائے ہوتے اور حساب سنسکرت وغیرہ کو گجراتی میں پڑھا ہوتا۔ اس طرح حاصل کئے ہوئے علم میں میں نے اپنے پڑوسیوں کو آسانی سے حصہ دار بنایا ہوتا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ عمل میں اپنی عادت اور ملک اور مادری زبان کے لئے اپنے بے حد پریم کے باعث عوام کی خدمت میں میں اور بھی زیادہ وقت نہ دے سکتا۔

یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ انگریزی یا اس کے اعلےٰ ادب کا میں مخالف ہوں۔ ہریجن میری انگریزی سے محبت کا کافی ثبوت ہے۔ لیکن اس کے ادب کی اہمیت ہندوستان کے لئے اس سے زیادہ مفید نہیں جتنی کہ اس کی معتدل آب و ہوا یا وہاں کے خوبصورت نظارے۔ ہندوستان کو تو اپنی ہی آب ہوا۔ نظاروں اور ادب میں ترقی کرنی ہوگی۔ پھر چاہے یہ انگریزی آب و ہوا۔ نظاروں اور ادب سے گھٹیا درجے کے ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو تو اپنی خود کی ہی وراثت قائم کرنی چاہیئے۔ اگر ہم دوسروں کی وراثت لیں گے۔ تو اپنی ضائع ہو جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ غیر ملکی سامان سے ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ میں تو چاہتا ہوں۔ کہ ملک اپنی ہی زبان کا ذخیرہ جمع کرے اور اس کے لئے دنیا کی دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اپنی ہی دیسی

زبانوں میں جمع کرے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی عمدہ تصانیف کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجھے بنگالی پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عمدہ تراجم کے ذریعے میں اسے حاصل کرلیتا ہوں۔ اسی طرح ٹالسٹائی کی مختصر کہانیوں کی قدر کرنے کے لئے گجراتی لڑکے لڑکیوں کو روسی زبان پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اچھے تراجم کے ذریعہ وہ انہیں پڑھ لیتے ہیں انگریزی کو اس بات کا فخر حاصل ہے۔ کہ دنیا کی بہترین ادبی تصانیف شائع ہونے کے ایک ماہ کے اندر اندر عام فہم انگریزی میں ان کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں شیکسپیئر اور ملٹن کے اعلےٰ خیالات اور تصانیف کے لئے مجھے انگریزی پڑھنے کی ضرورت کیوں ہو؟

یہ ایک مناسب تجویز ہوگی۔ کہ ایسے طلبا کی ایک علیحدہ جماعت بنا دی جائے جن کا کام یہ ہو۔ کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں پڑھنے لائق جو عمدہ مصالحہ ہو۔ اس کو پڑھیں۔ اور دیسی زبانوں میں اس کا ترجمہ کریں۔ حکومت نے تو ہمارے لئے غلط راستہ منتخب کیا ہے اور عادت ہو جانے کی وجہ سے غلطی ہی ہمیں ٹھیک معلوم ہونے لگی ہے۔

ہماری اس مصنوعی ہندوستانی تعلیم سے لاکھوں آدمیوں کا روز بروز جو نقصان ہو رہا ہے۔ اس کے ثبوت روزانہ ہی مجھے مل رہے ہیں۔ جو گریجویٹ میرے معزز رفیق ہیں۔ انہیں جب اپنے اندرونی خیالات کو ظاہر کرنا پڑتا ہے تو وہ خود پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ تو اپنے ہی گھروں میں اجنبی ہیں۔ ان میں مادری زبان کے الفاظ اور فقروں تک کا سہارا لئے بغیر وہ اپنی تقریر کو ختم نہیں کر سکتے۔ نہ انگریزی کتاب کے بغیر وہ رہ سکتے ہیں۔ آپس میں بھی وہ اکثر انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی مثال میں یہ بتانے

کے لئے دے رہا ہوں۔ کہ اس بُرائی نے کتنی گہری جڑ پکڑ لی ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو سدھارنے کی خود جان بوجھ کر کوشش نہیں کی۔

سر جگدیش چندر بوس کی مثال

ہمارے کالجوں میں جو وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے۔ کہ کالجوں میں پڑھنے کی وجہ سے اتنے طلباء میں سے اگر ایک جگدیش بوس بھی پیدا ہو سکے۔ تو ہمیں اس نقصان کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ بربادی ضروری ہوتی۔ تو میں بھی ضرور اس دلیل کی تائید کرتا۔ لیکن میں امید کرتا ہوں۔ کہ میں نے یہ بتا دیا ہے۔ کہ یہ نہ تو لازمی ہے اور نہ ہی ضروری تھی۔ کیونکہ جگدیش بوس موجودہ تعلیم کی پیداوار نہ تھے۔ وہ تو سخت مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنی محنت کی وجہ سے اونچے اٹھے۔ اور ان کا علم تقریباً ایسا بن گیا۔ جو عوام کے سمجھنے کی چیز نہیں۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ہم یہ سوچنے لگے ہیں۔ کہ جب تک کوئی انگریزی نہ جانتا ہو۔ تب تک وہ بوس کی طرح عظیم سائنسدان ہونے کی امید نہیں کر سکتا۔ یہ ایسا غلط خیال ہے۔ جس سے زیادہ میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ہم اپنے آپ کو لاچار سمجھتے معلوم ہوتے ہیں اس طرح ایک جاپانی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔

یہ بُرائی جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اتنی گہری ہے کہ کوئی حوصلہ افزا جسارت کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ہاں کانگریسی وزرا چاہیں۔ تو اس بُرائی کو دور نہ بھی کر سکیں۔ تو اسے کم تو کر ہی سکتے ہیں۔

یونیورسٹیاں آزاد ہوں

یونیورسٹیوں کو آزاد ضرور بنانا چاہئے حکومت کو تو عام طور پر انہیں کو تعلیم دینی چاہیئے۔ جن کی خدمات کی اسے ضرورت ہو۔ اور سب کی پڑھائی کے لئے

اسے خود ان کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ ذریعہ تعلیم تو فوراً تبدیل ہونا چاہیئے۔ اور صوبائی زبانوں کو اُن کا مناسب درجہ ملنا چاہیئے۔ یہ جو روز بروز قابل سزا بربادی ہو رہی ہے۔ اس کی بجائے تو مستقل طور پر بدانتظامی ہو جانا میں پسند کروں گا۔

صوبائی زبانوں کا درجہ اور استعمال کی قیمت بڑھانے کیلئے میں چاہونگا کہ عدالتوں کی کارروائی اپنے اپنے صوبہ کی ہی زبان میں ہو۔ صوبائی اسمبلیوں کی کارروائی بھی صوبائی زبان یا جہاں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں۔ ان میں ہونی چاہیئے۔ اسمبلیوں کے ممبروں سے میں کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اگر وہ چاہیں تو ایک ماہ کے اندر اندر اپنے صوبے کی زبانیں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ تامل زبان کے لئے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں جو وہ تیلگو۔ ملائیلم اور کنٹرے کے جو کہ سب تامل سے ملتی جلتی ہی ہیں۔ معمولی صرف نحو اور دو چار سو الفاظ کو آسانی سے نہ سیکھ سکے۔

میری رائے میں یہ کوئی ایسا سوال نہیں ہے۔ جس کا فیصلہ ادیبوں کے ذریعہ ہو۔ وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کس مقام کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کس زبان میں ہو۔ کیونکہ اس سوال کا فیصلہ تو ہر ایک آزاد ملک میں پہلے ہی ہو چکا ہے۔ نہ وہ یہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ کن مضامین کی پڑھائی ہو۔ کیونکہ یہ اس ملک کی ضروریات پر منحصر ہے۔ جس ملک کے بچوں کی پڑھائی ہوتی ہے انہیں تو بس یہ سہولیت حاصل ہے۔ کہ ملک کی خواہش کو حسب ضرورت عمدہ شکل میں عمل میں لائیں۔ غرضیکہ جب ہمارا ملک حقیقی معنوں میں آزاد ہو گا۔ ادیب تعلیم کا سلسلہ مرتب کریں گے۔ اور پھر اس کے مطابق تعلیمی کتابیں تیار کریں گے۔ اور آزاد ہندوستان کی تعلیم حاصل کرنیوالے غیر ملکی حاکموں کے تحت

جواب دیں گے۔ جب تک تعلیم یافتہ طبقہ اس سوال کے ساتھ مذاق کرتا رہے گا۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ ہم جس آزاد اور صحت مند ہندوستان کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس کی تعمیر نہ ہو سکیگی۔ ہمیں تو سخت کوشش کے ذریعہ اپنی غلامی سے آزاد ہونا ہے۔ پھر چاہے وہ تعلیمی ہو یا اقتصادی۔ مجلسی ہو یا سیاسی۔ تین چوتھائی جنگ تو وہی کوشش ہوگی۔ جو کہ اس کے لیئے کی جائیگی۔

پروفیسر این۔ جی۔ رنگا۔ ایم۔ ایل۔ اے

گاندھی جی کا طریقہ تعلیم اور عوام کی تعلیم

سب لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہم سب کے اولین اور اہم فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ لاعلمی دُور کی جائے۔ اور لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ اور سکول جانیوالے بچوں کو سکولوں میں بھیجا جائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنا مشکل ضرور ہے۔ لیکن ناممکن نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ پانچ سال میں سب بچوں کو سکول میں داخل کرا سکتے ہیں۔ اور دس سال میں بڑی عمر کے طالب علموں کی تعلیم بن القلبلی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ پبلک کارکن اپنا دل اور دماغ اس طرف لگا دیں۔ آخر روس میں کیا ہوا؟ ـ دس سال کے قلیل عرصہ میں اس نے کیا کر دکھایا۔ وہ پکا سرمایہ دار ملک۔ اشتمالیت کے زیر اثر آنے کے بعد کتنی جلدی تبدیل ہُوا۔ حاکموں کی محنت اور عوام کے وقتی تعاون کے انجام کار

روس نے پبلک کو تعلیم یافتہ بنانے میں جو کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا نمونہ دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

کچھ اعداد و شمار اور حقائق

اب ذرا اس مسئلہ کی بنیادوں کی طرف دھیان دیجئے۔ ۳۶-۳۵ء کے تخمینہ کے مطابق ہم نے ۲۵ کروڑ ۳۶ لاکھ روپے انگریزی علاقے میں ہر طرح کی تعلیم پر صرف کئے۔ اس میں سے ۵ کروڑ ۲۸ لاکھ پرائمری (ابتدائی) تعلیم پر۔ ایک کروڑ پچاس لاکھ یونیورسٹی اور ۵ کروڑ ۷ لاکھ ہائی سکولوں کی تعلیم پر صرف کئے۔ اس طرح آپ دیکھیں گے۔ کہ ابتدائی تعلیم اور اعلےٰ تعلیم کے درمیان جو خرچ کی تقسیم ہے۔ وہ ناانصافی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کو لے لیجئے۔ برطانیہ نے تمام پبلک کو ابتدائی (پرائمری) تعلیم دیدی ہے۔ یہاں تعلیم کے کل اخراجات میں سے ۶۲،۲ سینکڑہ ابتدائی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ ۰۸،۷ فی صدی یونیورسٹی تعلیم پر اور ۲۸،۵ سیکنڈری تعلیم پر۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ہم ۳،۴۳ فیصدی ابتدائی تعلیم پر اور ۴۰،۲ فیصدی سیکنڈری تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس میں ذرا سے بھی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اور نہ ہی نقصان کا امکان ہے۔ اگر تمام یونیورسٹیاں، کالج اور ہائی سکول پانچ سال کے لئے بند کر دیئے جائیں اور اس طرح جو روپیہ بچے۔ اسے پرائمری تعلیم کی اشاعت میں لگایا جائے۔

میرے اس مشورہ پر لوگ چونکیں گے اور چوکنے ہونگے۔ لیکن ان حقائق کی تحقیقات پر یہ ماننے میں ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی۔ کہ مندرجہ بالا خیال سے فائدہ ہونے کی گنجائش ہے۔ ذرا ان اخراجات پر نظر دوڑانے کی فکر کیجئے۔ ابتدائی تعلیم پر فی لڑکا سات روپے بارہ آنے خرچ ہوتا ہے۔ اور فی لڑکی نو روپے چھ آنے دو پائی

اس کے برعکس ہائی سکول اور یونیورسٹی میں فی لڑکا لڑکی سالانہ خرچ مندرجہ ذیل ہے۔

ہائی سکول:- لڑکی پچاس روپے پانچ آنے تین پائی۔ لڑکا اٹھتر روپے چودہ آنے دو پائی۔ یونیورسٹی:- لڑکی ۳۹۸ روپے آٹھ آنے آٹھ پائی۔ لڑکا ۱۹۱ روپے چھ آنے پانچ پائی۔ مڈل سکول:- لڑکی تیس روپے آٹھ آنے چھ پائی۔ لڑکا انیس روپے گیارہ آنے ایک پائی۔

اس طرح یہ سمجھنے میں ذرا بھی مشکل نہ ہوگی کہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم پر جو خرچ ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً بیس سے لے کر چالیس تک ابتدائی تعلیم کے طلب کو آسانی سے تعلیم دی جا سکتی ہے۔

اصل سوال

لیکن اصل سوال یہ ہے۔ کہ کیا عوام اس طرح تعلیمی خزانہ کو خرچ کرنے کے متعلق رائے دینے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ بہت ممکن تو یہ ہے کہ ہندوستان جس قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اس میں اسے ایک دھچکا سا لگا۔ لیکن بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک دم ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ نئے کالج اور ہائی سکولوں کی تنظیمی ہی نہ ہو۔ لیکن اس کو ساتھ ساتھ دھیان میں رکھ کر کوشش کرنی چاہیے۔ کہ یونیورسٹی۔ ہائی سکول۔ اور پرائمری سکولوں میں تعلیمی خرچ ایسا ہو کہ تعلیم کی اشاعت میں یہ بڑے پیمانے پر ممد و معاون ثابت ہو۔

اس کی ضرورت بھی تو ہے۔ آخر کالج اور سکولوں میں آپ کونسے بڑے فائدے کی بات دیکھ رہے ہیں۔ پچھلے سالوں کے تجربہ نے بتا دیا ہے۔ کہ ہماری سرکاری نوکریاں اور تجارتی میدان ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزی دینے کے ناقابل ہیں۔ موٹے اندازہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے نصف سے زیادہ اور ہائی سکولوں کے تین چوتھائی

طالب علم نوکری حاصل کرنے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میری سکیم کے مطابق اگر ہائی سکول اور کالج پانچ سال کے لئے بند کر دیئے جائیں۔ تو کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اس کے خلاف بھلائی یہ ہوگی۔ کہ ایسے نوجوان پیدا ہونے بند ہو جائینگے جو نہ تو کوئی کاروبار کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان میں کھیتی باڑی کرنے کی ہمت ہے۔

ابھی تک ہم نے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی حالت میں ایک ہی پہلو پر غور کیا ہے۔ تعلیم کے اخراجات کا ٹھیک اندازہ اس حالت میں پہلا صحیح قدم ہے۔ لیکن اس سے ہم زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں؟ ۔ اس لئے کہ مارچ ۱۹۳۶ء میں ۸۳۴۶۲۵۷ ایسے بچے تھے۔ جو سکول جانے کے قابل تھے۔ اور ۴۴۵۶۴۵۴ سکولوں میں تھے۔ پچاس فیصدی کے لئے سکولوں کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ ان سب بچوں کو سکول مہیا کرنے کے لئے قریباً ۴۴۸۱۶۱۴۶ روپے خرچ ہونگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا خرچ ہم بچوں کی تعلیم پر سالانہ کر رہے ہیں۔ اتنا ہی ہمیں باقی بچوں کے مردانہ سکولوں کے لئے کرنا پڑیگا۔ اور تقریباً اتنا ہی خرچ زنانہ سکول مہیا کرنے میں۔ اس طرح کل تیرہ کروڑ روپیہ کی ضرورت ہے ایسے بچوں کے لئے سکول تعمیر کرنے کے لئے ہے۔ یہ تیرہ کروڑ ہماری تعلیمی اخراجات کی بنیاد ہے۔

اس کا جواب وہی ہے جو واردھا سکیم میں ملتا ہے۔ اور جسے مہاتما جی نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔ تعلیم آزاد ہونی چاہیئے۔ میں بچوں کی تعلیم انہیں کوئی دستکاری کا کام سکھانے سے شروع کرونگا۔ اور اس طرح تعلیم کے آغاز سے ہی وہ آمدنی پیدا کر سکیں گے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس طرح کے تعلیمی سلسلہ کی بنیاد پر دماغ، جسم اور دل کو ترقی حاصل ہو کر بچہ زیادہ سیکھ سکتا ہے۔ وہ کیسے اور کیا سیکھ کر علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح تعلیم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس سکیم کے مطابق اگر کام کیا جائے۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ کیسی تبدیلی ہوتی ہے!

شری موتی لال رائے

انقلابی دور میں تعلیم کا مقصد اور شکل

اس مقدس یگیہ شالا میں حاضر ہوکر مجھے جس راحت اور جوش کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کا الفاظ کے ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتا۔ ازمنہ قدیم درشیوں کے زمانہ) کی مقدس یگیہ (ہون) کی آگ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ہون سامگری سے نکلی ہوئی خوشبو سے میرا دل خوش ہو رہا ہے۔ قدیم ہندوستان کی موسیقی اور مقدس وید منتروں کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آج زندگی کا حقیقی لطف اٹھایا۔

بنارس ہندوستان کا مقدس تیرتھ ہے۔ یہ پاک مقام ہندوستان کی قدیم تہذیب کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ اس میدان عمل میں نہ معلوم کتنے بڑے آدمیوں کو نئی نئی تحریکیں حاصل ہوئی ہیں۔ شاکیہ سنگھ کے گلے سے نکلی ہوئی فتح کی آواز پہلے پہل اسی بنارس کے میدان میں گونجی تھی۔ آچاریہ شنکر نے اسی مقام پر پہلے پہل ادویت ویدانت کا پیغام سنایا تھا۔ آب گنگا کے اثرات سے اس مقدس مقام پر کتنے گونگوں کو زبان ملی۔ انسانوں کی برائیاں دھل گئیں۔ اس کا علم کس کو ہے؟ اس مقدس تیرتھ پر کاشی ودیا پیٹھ کی تعلیمی اسکی دائمی عظمت کا باعث ہوگی۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

ہندوستان مذہب (دہرم) کا پروانہ ہے۔ ہندوستان یگیہ (قربانی) کی سرزمین ہے۔ ہندوستان کے ذرہ ذرہ میں پاک قدیمی یاد لپٹی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستان مشترکہ دہرم کا مسکن ہے۔ ہندوستانی دیوتاؤں کی عمر حاصل کرکے آج بھی زندہ "आप अमृतस्य पुत्र" "آب حیات کے فرزند"۔ رگ وید کا یہ منتر اسی ملک میں بولا گیا تھا۔ زمانہ کی تبدیلیوں کے باعث اس عظیم قوم کو فراموش سا کر دیا گیا ہے۔ مگر اس کی یاد ہمیشہ کے لئے محو نہیں ہوئی۔ ورنہ اس کاشی ودیا پیٹھ کا اجرا اس زمانہ میں کس طرح عمل میں آتا؟ اس عظیم ادارہ کی عقیدت سے جو اٹھارہ سال تک ریاضت کی گئی ہے۔ وہ بے فائدہ ثابت نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے اس آب حیات یعنی قدیمی علم ارواح (آتم گیان) کو دوبارہ زندہ کرنے کی یہ کوشش کیا کبھی رائیگاں جا سکتی ہے۔

ہندوستان کا دہرم

ہندوستان کا دہرم عالمگیر ہے۔ تمام ذی روح کے لئے ہے۔ ہندوستان کے دہرم کا مقصد ہے روح کی بیداری اور ترقی - یہ دہرم نہ ہی مخنث کا ہو سکتا ہے اور نہ ہی پنگے (مفلوج) کا۔

دہرم آب حیات کی طرح ہے۔ جس تعلیم سے یہ دہرم حاصل ہوتا ہے وہی آب حیات کی روح (آتما) کی ریاضت ہے۔ روح (آتما) کی ترقی و عروج کا مقصد محض روحانی ہے۔ اس غلط فہمی سے اندھے ہو کر موجودہ زمانہ کے تعلیمی ماہرین کی ایک جماعت دہرم کو قومی آزادی اور اس تحریک کے لئے رکاوٹ سمجھتی ہے۔ مادہ پرستی کی تعلیم کے زیر اثر وہ دہرم کی ضرورت کو ہی جواب دینے لگی ہے۔ دہرم کی بنیاد پر ہی یہ ملک کھڑا کیا گیا ہے۔ اس

معیار کو خواب اور فرضی کہکر اڑا دینے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ وہ جانتے نہیں کہ ہندوستان کا دہرم مادہ پرستی کو محض مادہ پرستی سمجھنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ فانی دنیا کے علاوہ لافانی خدا کے حصول کے بعد ان دونوں کے اجتماع کے درمیان روحانیت کے اعلےٰ راز کا علم اسی قوم کو ہوا ہے۔ ہماری تعلیم کا مقصد علم الروح (آتم گیان) ضرور ہے۔ مگر اس نے سائنس کو بھی اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اور اونچی آواز سے اعلان کیا ہے۔

"यज्ज्ञात्वा नेह भूयोऽन्यज्ज्ञातव्य-
मवशिष्यते" - یعنی جسے جان لینے کے بعد جاننے کے لئے

کچھ اور باقی نہیں رہتا۔ اس کو جاننا ہی اس قوم کی سائنٹفک تعلیم ہے۔ اگر روحانی زندگی ہی قوم کا سب کچھ ہوتا۔ تو اٹھارہ علوم کی تعلیم میں آیوروید (طب) دھنسر وید (علم الحرب) گاندھرو وید (موسیقی) ارتھ شاستر (اقتصادیات) وغیرہ کو کیوں شامل کیا جاتا۔

ہندوستانی تعلیم ہندوستانی تعلیم کا دو پہلو مقصد دینوی اور روحانی ہے۔ دونوں ہی قسم کی زندگیوں کے عروج کے ذرائع ہیں۔ اس لئے اس قوم کا عروج اور نجات ایسی قومی تعلیم سے ہی ثابت ہوگی جس کی بنیاد دہرم (سچائی) ہو۔

زیادہ واضح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس تعلیم سے روح (آتما) کی بیداری، جس تعلیم سے ملک کی سرشت میں آزادی آتی ہے۔ وہی تعلیم ہندوستانی تعلیم ہے۔ تمام بیرونی علم اس اندرونی علم کے ہی پیٹ میں ہے اسی سے یہ اعلےٰ تعلیم ہندوستان کے درشنوں کی کتب اور شاعری یہاں تک کہ دستکاری اور سائنس میں بھی خود بخود داخل ہو گئی ہے۔ یہ ملک صرف شرقی

سمرتی اور نیائے کا ہی ملک نہیں ہے۔ یہ مختلف اشیا کے ماہر علم کرناد کی جائے
پیدائش بھی ہے۔ ناگ ارجن کے بھی بہت پہلے کے بیشمار سائنسدانوں کے نام
ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھاندوگیہ اُپنشد کے نارد و سنتکمار سمواد (بات
چیت) سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ دیو گیان (الہیات) دھن ودیا (اقتصادیات)
زلزلوں وغیرہ کے متعلق علم۔ علم نباتات و حیوانات۔ علم المذم۔ علم نجوم۔
علم سیارگان۔ سانپوں کے متعلق تعلیم وغیرہ کی تحقیقات بہت پرانے وقتوں
میں شروع ہوئی تھی۔ صرف علم نباتات و حیوانات کے متعلق شالی ہوتر۔
پالکپیہ۔ بجے دت۔ نکل۔ دا بھٹیہ وغیرہ عالم مصنفین۔ دراں سکے اور
دیگر مصنفوں کے تصنیف کردہ گجا آیور وید۔ مرگ پکشی شاستر۔ سینک
شاستر وغیرہ نام کی تقریباً ۲۰ بیس کتب کے ناموں کا ریسرچ سے پتہ لگا
ہے۔ یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ کیا ہمیں کانٹ۔ ہیگل۔ ہربرٹ سپنسر
کومٹ وغیرہ مغربی فلاسفروں اور نیوٹن۔ کیلون۔ فرائیڈ وغیرہ مشہور مغربی
سائنسدانوں کی سائنس سے متعلق کتب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیا کارل مارکس
کی نئے مجلسی نظام کے متعلق کتاب نہیں پڑھنی چاہیئے۔ نہیں میرا مطلب
یہ ہرگز نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمیں اگر مغربی علوم اور سائنس
کو سیکھنا ہی ہے۔ تو اس کے پہلے ہندوستانی اعلےٰ تعلیم کی روشنی سے ہمیں
اپنا دماغ منور اور مجلا کر لینا چاہیئے۔ ہندوستانی تعلیم کی مذمت و نفرت
کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اسے ترک کرنا چاہیئے۔ جو تعلیم ہماری بنیاد
ہے۔ اُسے نامکمل سمجھ کر ہم اس سے عقیدت نہیں کر سکتے۔ اور عقیدت مند
بننے کے بغیر قومی تعلیم سے علم اور عمل حاصل نہیں ہوتے۔ ہندوستان کی
آزادی کی حفاظت کرنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی قومی زندگی کو اور

ریاضت کو تمام انسانیت سے علیحدہ تنگ دائیرہ میں رکھنا چاہتا ہوں۔
ہندوستان کے ماہرین علوم کی دلیل اور اصلیت کا علم اگر حقیقی معنوں میں
درست ہو۔ تو انسانیت کے مفاد کے لئے ہی اس صداقت کو ہمالیہ کی طرح
مستقل رکھنا پڑے گا۔ یہ غرور بھی نہیں ہے اور تنگ خیالی بھی نہیں۔ مکمل
انسانیت کی تکمیل کا تیرتھ ہے ہندوستان۔ دنیا کی تمام اقوام اس تیرتھ کے
کے سامنے سر جھکائیں گی۔ خود غرضی۔ فریب۔ ظلم۔ بدچلنی سے جو بدامنی اور
دہشت تمام دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اس کے لئے امن و سکون کا پیغام
ہندوستان کے دل میں ہی چھپا ہوا ہے۔ سر میں آگ لگنے سے پانی کی تلاش
کرنی ہی پڑتی ہے۔ آج ہندوستان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد ہونا
چاہیئے۔ اس کی ریاضت کا میدان ہے ہندوستان کا مندر۔ ہر ملک
میں یہ مندر سناتک (گریجوئیٹ) ہی بنلاتے ہیں۔

مجلسی امتیاز طویل عرصہ کی مایوسی سے یہ قوم تنزل کو پہنچ گئی۔
اس کے دوبارہ عروج اور ناگفتہ بہ حالت کی اصلاح
کے لئے ہم آنکھوں کے سامنے سب سے پہلے مجلسی زندگی کا امتیاز آ کھڑا ہوتا
ہے۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قومی آزادی حاصل کرنے
کی کوشش کے ساتھ ساتھ مجلسی جمہوریت کے خواب مالی اشتمالیت کی
نظر آہستہ آہستہ ہونے لگی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنے معیار کا دھیان رکھنا ہوگا
اشتمالیت بھی ہندوستان کی ہی کامیابی کا راز ہے۔ منو۔ شوییت کیتو۔ یاگیہ و
لکیہ اس زمانہ کے حالات کے ۔ ۔ ۔ مطابق اس اصول کی وضاحت اور
اس کے ماتحت مجلسی نظام کے قواعد مرتب کر گئے ہیں۔ ہر زمانہ میں اشتمالیت
کی تابعی کے لئے کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ہم شری کرشن کو ہندوستان کا سب

سے پہلا جمہوریت پسند اور اشتمالیت کے اصول پر چلنے والا لیڈر کہہ سکتے ہیں
سری کرشن کے اصول کی بنیاد پر ہندوستانی طریقہ سے ہندوستان میں اشتمالیت
کی اشاعت کی جاسکے۔ تو ہندوستان تمام دنیا کے لئے ایک مثال بن جائے
سری کرشن نے کہا ہے :-

विद्याविनयसम्पन्ने ब्राह्मणे गवि हस्तिनि।
शुनि चैव श्वपाके च पण्डिता समदर्शिनः॥

ذی علم متحمل مزاج براہمن۔ چانڈال۔ گائے۔ ہاتھی۔ کتا۔ ان سب کو
سمجھدار آدمی ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس یکسانیت کے خیال میں جو
اعتقاد رکھتے ہیں۔ شری کرشن انہیں ہی سب سے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہندوستان
میں اشتمالیت لفظ کا مطلب مقابلہ یا موازنہ ہی مانا گیا ہے۔ مگر اس سے
انسان کے اوصاف اور چلن سے متعلق خصوصیت ضائع نہیں ہوئی۔
بیرونی اشیا پر سب کا یکساں حق ہے۔ یہاں اشتمالیت کا یہ مطلب ہرگز
نہیں لیا گیا۔ سامیہ کا لغوی مطلب ہے قائمقام یا بدل۔ اس اشتمالیت
کی تابعی کے لئے نئی تعلیم اور بیداری سے قوم کو ترقی دینا ہوگی۔ بری
حالت کو سدھارنے کا حقیقی احساس انسان کی اندرونی طاقتوں کی ترقی
پر منحصر ہے۔ بیرونی طور پر نظر آنے والے امتیاز کی جو شکل ظاہر ہوتی ہے
کیا وہ اندرونی شکل کا ہی عکس نہیں، قوم کی اندرونی حالت ہم جتنی پاک و
صاف کر سکینگے۔ ہماری اقتصادی اور مجلسی حالت میں بھی اتنی ہی اصلاح
اور ترقی ہوگی۔ اس کے بعد قواعد و ضوابط د طریقے ہیں۔ مغربی اشتمالیت
کا جب تک دیوالہ نہ نکل جائے گا۔ تب تک ہندوستان کی واضع اشتمالیت
کا حصول ناممکن ہے۔ مگر ہندوستانی اشتمالیت کے راز کی اشاعت کا

دن بھی بہت دُور نہیں ہے۔ قومی تعلیم سے ہی ہم کو اس کا پتہ لگیگا مختلف اشتال کے امتیاز و فرق کی طرح حالات کی تفریق بھی حسد اور نفرت کا سبب نہ بن کر ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو کر باہمی تعلقات اور تعاون کے بندھن میں بندھکر روح کے ارتقا کو مکمل کرلیگا۔ اس طرح ایک فرقہ اور جماعت کی دوسرے فرقہ اور جماعت سے لڑائی کی وجہ ختم ہو جائیگی

آزادی کا معیار

قومی زندگی میں مکمل آزادی کے پیغام عظیم کو ہم بھول نہیں سکتے۔ مگر ہماری آزادی کا معیار محض جغرافیائی نہیں۔ اس کی بنیاد ہے تہذیب۔ ہندوستانی جذبات اور ریاضت کے ذریعہ ہی ہم قومی جمہوریت تیار کریں گے۔ وہ ملک ہو گا اپنی ہی شکل کا عکس۔ قومی تہذیب کا آئینہ۔ فرقہ دارانہ امتیازات کو ہم تہذیبی میلان اور اندرونی یکسانیت کی مدد سے دُور کر دینگے۔ یہاں بھی قومی تعلیم ہی اتحاد کے لئے سنگ سیل کا کام دیگی۔ اسی وجہ سے تعلیم کی اہمیت آج بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

مالی نقطہ نظر سے تعلیم فایدہ مند ہونی چاہیئے یا نہیں۔ اس پر بھی ماہرین فن غور کر رہے ہیں۔ اعلے تعلیم اگر زندگی کی کمیوں کو دُور کرنے کے ناقابل ہو۔ تو ایسی نکمی تعلیم سے قوم کی طاقت میں اضافہ نہ ہو گا۔ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس سے روزی کمانے کی طاقت اور ہوشیاری حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو اس کو عمل میں لانے کے لئے میدان نہیں ملتا۔ اس لئے انفرادی مشکلات میں اضافہ ہونے سے حاجتمندوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی تعداد بڑھیگی اور اس سے انقلابی ذہنیت یقیناً پیدا ہو گی۔ اس کی مدد سے ملک میں انقلابی

تحریک کا زور پکڑنا بھی ناممکن نہیں ہے۔ مگر تعلیم کے اس اُلٹے نتیجہ کو کوئی اچھا نہیں سمجھ سکتا۔

قومی تعلیم میں علم الروح (آتم گیان) کے ساتھ ساتھ عمل کے متعلق رجحانات کی تحقیقات کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ تعلیمی تحقیقات کے میدان سے اس اعمال کی تعلیم کا زمانہ اور میدان ذرا دور ہی رکھا جائے تو اچھا ہے سکول میں جو اوصاف اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کو عمل میں لانے کی قابلیت کی تعلیم کے لیئے بھی کچھ وقت کی ضرورت ہے۔ آج ایسے کسی انتظام کی ضرورت ہے۔ جس سے ہر طالب علم کو خودداری اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے کی مہارت سے اپنی ضروریات اور کمیوں کی تکمیل کی طاقت اور موقعہ بھی حاصل ہو۔

میں جانتا ہوں۔ کہ شری کاشی ودیا پیٹھ کا ہر ایک طالب علم ہندوستان کے مختلف میدانوں میں قومیت کی فتح کا جھنڈا لہرائے ہوئے ہے۔ اور اسی لیئے میں آج کے گریجوئیٹوں سے بھی کہتا ہوں۔ کہ آتم وشواس (جذبۂ خودداری) کو مستقل رکھتے ہوئے ایک فاتح کی طرح میدان عمل میں داخل ہوں۔ وہ یاد رکھیں۔ کہ تعداد کی زیادتی سے قوم اور ملک نہیں بنتے۔ ملک کی عظمت کی حفاظت اس کی خوبیوں سے ہوتی ہے۔ گریجوئیٹوں کو مخاطب کر کے کہتا ہوں "سامنے وسیع میدان عمل ہے"۔ جو زندگی آج حاصل ہوئی ہے۔ وہ صرف ایک فرد واحد کی نہیں۔ وہ ہے ملک کی۔ خدا کی۔ وطن کی۔ مجلسی عیش و عشرت کی آب و ہوا سے ملک کا ناقابل بیان نقصان ہوا ہے۔ مالی امتیازات کے خارزار میں ملک کا دم گھٹ رہا ہے۔ غلامی کے مصائب سے ہم بیہوش سے ہو گئے ہیں۔ نئے ملک اور قوم کے رہنماؤں کو قوتِ ارادی کا استعمال کرکے بھی

ہندوستان کی شہرت محفوظ رکھنی ہوگی۔ اندرونی ریاضت سے خود کامیاب ہو کر آپ لوگ آج قوم اور ملک کی اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کا عہد لیں آج کی اس تقریب کی مقدس آگ تمہارے دلوں میں ہمیشہ روشن رہے اے ہندوستان کے نونہالو! اٹھتے ہوئے نوجوانو! آپ لوگوں کی آواز سے آواز ملا کر آج میں بھی کہتا ہوں۔

पूर्णमदः पूर्णमिदं पूर्णात्पूर्णमुदच्यते ।
पूर्णस्य पूर्णमादाय पूर्णमेवावशिष्यते ॥

شری سمپورنانند جی وزیر تعلیم یو۔پی

موجودہ طریقۂ تعلیم کے نقائص

نینی تال میں منعقدہ سکول انسپکٹروں کی کانفرنس میں کی گئی تقریر

نینی تال میں ۲۲ جون کو یو۔پی کے سکول انسپکٹروں کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صوبہ کے وزیر تعلیم شری سمپورنانند نے جو تقریر کی اس کا نچوڑ درج ذیل ہے۔

"آج کل صوبہ کے طریقۂ تعلیم پر غور کیا جا رہا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کی بنیاد لارڈ میکالے نے رکھی تھی۔ اور اس کا اولین مقصد طالب علموں کو سرکاری نوکریاں دلانے میں امداد دینا تھا۔ مگر جب اور

اب کے حالات میں بہت فرق ہے۔

ہماری ضروریات کے مطابق ہماری تعلیم کے اصولوں میں بھی فرق پڑتا رہا ہے موجودہ طریقہ تعلیم کے مبصر کبھی کبھی یہ سوچ لیتے ہیں کہ آج کل کا طریقہ تعلیم پتھر کی طرح تبدیل نہ ہونے والا ہے۔ اور پچھلی ایک صدی میں اس میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہوئی۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس میں لگاتار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے۔ کہ ہمارے آج کل کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق اس میں اور بھی تبدیلیاں ہوں۔

اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ موجودہ طریقہ میں کتابوں کو ہی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ ایسی تعلیم حاصل کر کے سکولوں سے نکلتے ہیں۔ وہ لکھنے پڑھنے کے کام کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ کہ ایک غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم دیئے جانے کی وجہ سے تعلیم آسانی سے ذہن نشین نہیں ہوتی۔ اور تھوڑے سے علم کے حصول کے لئے ظاہرا طور پر بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ہماری عام واقفیت کی حدود بہت ہی محدود ہوتی ہیں۔ اور ہمیں مختلف علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

موجودہ طریقہ تعلیم کا ایک نقص یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ یہ ہمیں زندگی کی حقیقت سے بہت دور رکھتی ہے۔ اور اس میں چلن کی تعمیر کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ انسپکٹروں کو چاہیئے کہ وہ ان سوالات پر غور کریں۔ اور اپنی قیمتی رائے حکومت کے سامنے رکھیں۔

ہمیں دو تین باتوں کا دھیان رکھنا ہے۔ یہ نفسیاتی سچائی ہے۔ کہ بچے عمل کے ذریعے زیادہ جلدی سیکھ سکتے ہیں۔ اور وہ ہی عمل سب سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ جو بچوں کے مختلف قوائے مدرکہ میں یکسانیت اور تعاون پیدا کرتا

ان کے سب عمل چاہے وہ کھیل کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔ ان کی مستقبل زندگی میں مدد دیتے ہیں۔ اس لئے دستکاری سے متعلق تعلیم دیتے وقت ہمیں اس نفسیاتی سچائی کا پورا پورا دھیان رکھنا چاہیئے۔

اس کے ساتھ ہی میرے خیال میں یہ بھی ضروری ہے کہ صحیح وصاف علم کے حصول کی طرف زیادہ دھیان دیا جائے۔ اس بات کا بہت خطرہ ہے۔ کہ دستکاری کی تعلیم میں علم کے حصول کا خیال ہی نہ رکھا جائے۔ ہمیں اس کے لئے محتاط رہنا چاہیئے۔ کہ جو طالب علم ہمارے تعلیمی اداروں سے نکلیں۔ وہ جسمانی محنت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوں۔ ان کا جسم تندرست و توانا ہو۔ ان کا دماغ نئے علم کو حاصل کر سکے۔ اور وہ اعلےٰ تعلیم سے فایدہ اٹھا سکیں ورنہ ہمارے لئے یونیورسٹی تعلیم کی معزت کو کم کرنا ممکن نہ ہوگا۔

تیسرا سوال جسمانی تعلیم کا ہے۔ میری سمجھ میں ہمیں سب سے زیادہ اس بات کا دھیان رکھنا ہے۔ کہ ہم جو جسمانی تعلیم دیں۔ وہ طلبا کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرے۔ انہیں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ حفاظت خود اختیاری ہی جسمانی تعلیم کا اولیں مقصد ہونا چاہیئے۔

میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہم کوئی ایسی ترکیب نکال سکیں۔ جس سے ہمارے طالب علم اپنے جسم کو مقدس شے سمجھکر اس کا غلط استعمال نہ کریں۔ ہمیں اس بات کی شکایت بار بار سننے میں آتی ہے۔ کہ سکولوں میں نفسانیت کا عیب روز افزوں ترقی پر ہے۔ اور ایسے واقعات زیادہ تر استادوں کے علم اور امداد سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہمارا اہم فرض ہے کہ ہم ایسی مذموم حرکات کو جلد از جلد روکیں۔ اسی سلسلہ میں ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیئے۔ کہ اونچی جماعتوں کے طالب علم کو جنسی میدانات وکام شاستر سے تھوڑا بہت واقف کرنا

مناسب ہو گیا یا نہیں۔ جن دنوں میں ہیکا پیز میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ میں نے اس کا تجربہ کیا تھا۔ اور میں نویں اور دسویں جماعت کے طالب علموں کے درمیان اس سے متعلق تقاریر کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ مجھے اس میں بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

ڈاکٹری (طبی) معائنہ کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ اور ہمیں ایسی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ ہمارے طلبا کا سال بھر میں ایک یا دو دفعہ طبی معائنہ ضرور ہوا کرے۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال ہے۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری بے قاعدگی ہے۔ جس وقت کوئی کھانا کھاتا ہے۔ اسی وقت دوسرا شخص دفتر میں کام کرتا ہے۔ اور تیسرا آدمی گھومنے پھرنے کے لئے باہر نکلتا ہے۔ شاید یہ سننے میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ہم اپنے طالب علموں میں مقررہ وقت پر کام کرنے کی عادت ڈالیں۔

سکول کے انتظام کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ ہمیں اکثر یہ شکایتیں سننی پڑتی ہیں۔ کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے استادوں سے ایسے کام کرائے جاتے ہیں۔ جو کسی طرح بھی مناسب نہیں کہے جا سکتے۔ اور انہیں ان کاموں کے نہ نہ کرنے پر سزا بھی دی جاتی ہے۔ ہمیں ان خرابیوں کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر ساتھ ہی ہمیں بورڈوں اور عوام کے جوش و خروش کو کم نہیں کرنا ہے۔ اس لئے ہمیں ایک ایسی سکیم مرتب کرنی ہے۔ جس سے ان خرابیوں کا قلع قمع ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ جمہوریت کے جذبات بھی داخل ہوں۔

ہمارے سامنے پرائیویٹ مڈل سکولوں کے انتظام کا بھی سوال ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ غیر سرکاری سکولوں کے استاد مطمئن نہیں۔ اس لئے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف پرائیویٹ اشخاص کے جذبہ

عمل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیں۔ وہاں دوسری طرف پرائیویٹ سکولوں کے استادوں کی حالت سدھارنے کی بھی کوشش کریں

ایک دو باتیں اور ہیں۔ اب تک سکول طالب علموں اور استادوں کی ہی جائیداد سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہے۔ کہ سکول دوسری طرح کے کاموں کے بھی مرکز بنیں۔ مثال کے طور پر ہم ان سکولوں سے دیہات سدھار کے کام میں مدد لے سکتے ہیں۔ صوبہ کے مختلف مقامات میں پنچایت گھر بنوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب تک یہ گھر نہ بن سکیں۔ تب تک کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہم سکولوں کے خالی کمروں کو استعمال نہ کر سکیں۔ سکولوں کو دیہاتیوں کی تفریح کا مرکز بنانا چاہیئے۔ اگر لوگ آکر ان کو استعمال کرنا چاہیں۔ تو ہمیں انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیئے۔ سچ پوچھیئے تو ہمیں یہ چاہیئے۔ کہ ہم انہیں سکولوں میں خود بلائیں۔ اور ان سے کہیں۔ کہ وہ سکولوں کو اپنی ہی چیز سمجھیں۔

آپ جانتے ہیں۔ میں خود کیا کرتا ہوں۔ میں جب کبھی دورہ پر جاتا ہوں۔ تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ ڈپٹی کلکٹر۔ چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ۔ تحصیلدار اور رئیسوں سے تو ملتا ہی ہوں۔ ساتھ ہی استادوں سے ملنا کبھی نہیں بھولتا۔ ہمارا یہ فرض ہے۔ کہ ہم سکول کے استادوں کو ایک خاص درجہ اور عزت دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اتنا ضرور خیال رکھیں کہ یہ استاد عزت اور عقیدت کے اہل ہوں بالغوں کو تعلیم یافتہ بنانا بھی ہمارا فرض ہے۔ اس کام کے لئے تحریک شروع کی گئی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں۔ کہ اس میں ڈسٹرکٹ بورڈ سکولوں کے استادوں سے مدد لیں۔ اس کام کے لئے تمام استادوں کو مالی انعامات دینا تو ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اس بات کا دھیان ضرور رکھا جائیگا۔ کہ جو استاد اس

کام میں جوش اور سرگرمی کا اظہار کرینگے۔ ان کی کسی نہ کسی طرح حوصلہ افزائی ضروری کی جائیگی۔ کچھ اخبارات میں خطوط شائع ہوئے ہیں کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے استادوں پر فالتو کام کا بوجھ ڈال کر ان سے ناانصافی کی جا رہی ہے۔ ہم کسی سے زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ جو لوگ کام کرنا نہیں چاہتے وہ نہ کریں۔ اسی سلسلہ میں سکولوں کے استادوں کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کہیں کہیں ان استادوں سے بہت برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایگزیکٹو کا چھوٹے سے چھوٹا آدمی اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا ہے۔ یہ بات مناسب نہیں۔ یہ انسپکٹروں کے ہاتھ میں ہے۔ کہ وہ اپنے ماتحت کام کرنے والے استادوں کے درجہ کو بڑھائیں۔ آپ یہ سب کام اس لئے نہیں کرینگے۔ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں آج کل صوبہ کی حکومت ہے۔ ان کی پالیسی پر عمل کرنا آپ کے لئے ضروری ہے بلکہ اس لئے کہ یہ آپ کا اپنا کام ہے اور آپ کو اپنے ملک کی خود تعمیر کرنی ہے۔

اگرچہ تعلیم میں فرقہ وارانہ جذبات داخل نہیں ہونے چاہئیں۔ پھر بھی ہر فرقہ و جماعت کے اشخاص کو زیادہ سے زیادہ سہولیات بہم پہنچانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ طالب علموں کو ہندوستانی تاریخ اس پہلو سے نہیں پڑھائی جاتی۔ کہ اس سے ان میں ہندوستانی ہونے کا غرور پیدا ہو۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک عظیم ملک کا ایک حصہ تصور کریں۔ لوگوں کا کچھ ایسا خیال ہے۔ گویا ہندوستان غلامی برداشت کرنے کے لئے ہی ہے۔ اور تمام غیر ملکی افراد اسے اپنا غلام بنائے رکھ سکتے ہیں۔ یہ بہت ہی غلط خیال ہے۔ اور ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ ہمارے طالب علموں میں ایسے خیالات داخل نہ ہونے چاہئیں۔

مجھے امید ہے کہ ہم اگلی جولائی سے اپنے سکولوں میں نئی زندگی دیکھینگے
میں چاہتا ہوں۔ کہ لوگ یہ محسوس کرنے لگیں۔ کہ ہم اپنے آپ کو موجودہ حالات
کے مطابق بنا رہے ہیں۔ اور ہمارے سکولوں میں نظم و نسق کی کمی نہیں ہے

ڈاکٹر بھگوان داس

بھارت ماتا کا مندر اتحاد کی علامت

پرمیشور۔ اللہ اکبر کی کائنات مجموعہ اضداد ہے۔ اس سے آرام بھی
ہے اور تکلیف بھی۔ گناہ بھی ہے اور ثواب بھی۔ جھگڑا بھی ہے اور میل
محبت بھی۔ ایک طرف حیوانی فطرت ہے اور دوسری طرف روحانی سرشت
ایک طرف شیطان فساد اور لڑائی بڑھاتا ہے۔ دوسری طرف فرشتہ امن
باہمی رفاقت اور عشق میں اضافہ کرتا ہے۔ دونوں ہی پرماتما۔ خدا کی مرضی
سے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ سب قوموں۔ سب زمانوں۔ سب مذاہب و
فرقوں کو اسی ایک پالنہار۔ خالق۔ مالک۔ رازق نے بنایا — اپنے
بنائے سب ہی مذاہب اور قوموں کے آدمیوں کو اس مادرِ ہند کی گود میں یکجا
کیا ہے۔ یہاں مسلمان بھی ہیں پارسی بھی۔ یہودی بھی ہیں عیسائی بھی ہندو
بودھ۔ جین۔ سکھ بھی ہیں۔ ضرور ہی اس دنیا کے مالک کی خواہش یہی ہوگی کہ
یہ سب میری اولاد۔ میرے بندے۔ آپس میں میل محبت کے ساتھ ان جڑے

ملک میں آرام سے زندگی بسر کریں۔ مجھ کو پہچانیں اور میری یاد کریں ۔

رام کہو یا رحیم کہو۔ دونو کی غرض اللہ سے ہے
دین کہو یا دہرم کہو ۔مطلب تو اسی کی راہ سے ہے
عشق کہو یا پریم کہو۔ مقصد تو اسی کی چاہ سے ہے
یوگی ہو یا سالک ہو۔ منشا تو دل آگاہ سے ہے
پھر کیوں لڑتا مور کھ بندے۔ یہ تیری خام خیالی ہے
ہے پیڑ کی جڑ تو ایک وہی۔ ہر مذہب یک ڈالی ہے

لیکن جب اللہ تعالےٰ، خدائے پاک ، پرم پوتر پرماتما ، جگت پتا نے دیکھا کہ باپ کے ڈر اور محبت سے بیوقوف لڑکے آپس میں لڑنا نہیں چھوڑتے ، تب اس نے خیال کیا کہ ماں کی محبت کے سامنے ان کی سب لڑائیاں ضرور بند ہو جائینگی۔ اور اس لئے اپنے ایک سچے بندے شو پرشاد کو محض ذریعہ بنا کر کل راز ، مایا کے مالک نے جو سورج چاند کو بھی چلاتا ہے اور ہر ایک ذرّہ کی بھی فکر کرتا ہے۔ یہ بیت المحبت تعمیر کروایا۔ تاکہ سب مذاہب کی یکساں عبادت گاہ (پوجا ستھان) ہو اور مادر ہند (بھارت ماتا) کی تمام اولاد (سنتان) سب دھرموں کی یہاں آدیں اور حب الوطنی (سودیش بھگتی اجنمی جنم بھومی کے پریم کے ذریعہ سے عشق حقیقی خدا کی محبت اور انسان کی محبت (بھگوت بھگتی اور وشو جننی بھگتی) بھی سیکھیں۔ ہر آدمی کے دل میں چھپے ہوتے اسی ایک پرمیشور۔ اللہ اکبر کو دیکھیں اور تمام مذہب کے اس سچے راز (ستیہ سار) کو پہچانیں۔ اور عمل میں لادیں جس کو سی پرماتما نے۔ عیسےٰ اور محمد اور دید دیاس ، سب کے منہ سے انجیل اور قرآن اور دیدوں میں کہلایا ہے۔

عیسےٰ مسیح نے انجیل میں کہا ہے

Do unto others as you wonto that they should do unto you, thio is whole of the law of the Prophet.

یعنی دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو۔ جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں۔ سب دھرموں اور تمام نبیوں کی تعلیم اتنی ہی ہے۔ قرآن مجید میں محمد صاحب پیغمبر نے کہا ہے: افضل الایمان ان تحب الناس ما تحب لنفسک

یعنی سب سے افضل۔ سب سے عمدہ۔ سب سے بڑا مذہب یہی ہے کہ جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ وہی دوسرے کے لئے چاہو۔ اور جو اپنے لئے کریہہ تکلیف دہ سمجھتے ہو۔ اسے دوسرے کے لئے بھی دکھدائی جانو۔

پانچویں وید مہابھارت میں مہرشی وید ویاس نارائن اوتار نے کہا ہے۔

श्रूयतां धर्मसर्वस्वं श्रुत्वा चैवावधार्यताम्।
आत्मनः प्रतिकूलानि परेषां न समाचरेत्।
यद्यदात्मनि चेच्छेत तत्परस्यापि चिन्तयेत॥

یعنی دھرم کا نچوڑ سنو اور سنکر اس کے مطابق عمل کرو۔ جو کام اپنے لئے تکلیف دہ سمجھتے ہو۔ وہی دوسروں کے لئے چاہو۔

The whole of the Law Arud Prophets

کے دھرم سروسو کے افضل الایمان کے یہ تمام الفاظ بھارت ماتا کے مندر کی دیواروں پر لکھ دیئے جائینگے تاکہ بھارت ماتا کی سب سنتان اس کو پڑھے اور عمل کرے اور ماتا کی گود میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے محبت کرے۔

قرآن شریف نے کہاہے۔ "الجنۃ تحت قدم الامم" یعنی ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت (سورگ) پھیلا ہوا ہے۔ جہاں محبت ہے وہیں بہشت ہے۔ جہاں دشمنی ہے وہاں نرک ہے (جہنم ہے) ماں کے پاس محبت ہے۔ اور سورگ بھی ہے۔ بھگوان منو نے کہا ہے۔

सहस्रं तु पितृन माता गौरवेणातिरिच्यते।

یعنی گورو تا (بزرگی) میں ماں کا درجہ والد سے ہزار گنا اونچا ہے۔

خاں عبدالغفار خاں سے بھی یہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ بھی اس موقعہ پر چند کلمے کہیں۔ اور مہاتما جی سے مندر کھولنے کی ہم لوگوں کی پرارتھنا میں شریک ہوں۔

خان عبدالغفار خان

پرانے زمانہ کا مذہب آج کل کے لوگ بالکل بھول گئے ہیں۔ جو اصلی مذہب ہے وہ تو کتاب میں ہے۔ اسے تو کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ پہلے کسی زمانہ میں مسجد میں سب مذہب والوں کو جانے کی اجازت تھی۔ مدینہ میں جو مسجد ہے۔ اس میں پہلے مسلمان بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور عیسائی بھی پرارتھنا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ زمانہ آج نہیں رہا۔ آج کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ لوگ پرانے زمانے کے مذہب کو بھول گئے ہیں۔ خوشی کی بات تو یہ ہے۔ کہ بھائی شیو پرشاد جی نے خدا کا گھر سب کے لئے قایم کر دیا ہے۔ انہوں نے ہندو مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی وغیرہ پر دیا (رحم) کر کے اسے بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد دلا دیا ہے۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

جو مندر ہے وہی گوردوارہ، مسجد اور گرجا گھر ہے۔ خدا ان کا مقصد پورا کرے۔

مہاتما گاندھی کی تقریر

مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا:۔ بھائی شوپرشاد۔ بھائیو اور بہنو۔ میں آپ سے کیا کہوں۔ میں سیگاؤں چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہتا تھا۔ مگر پریم انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ گجراتی میں ایک بھجن ہے جو شاید میراں بائی کا ہے۔ اس بھجن میں پریم کا مقابلہ سُوت کے کچے دھاگے سے کیا ہے۔ سوت کا کچا دھاگا ٹوٹ جاتا ہے۔ پریم کا سچا دھاگا نہیں ٹوٹتا۔ میں سیگاؤں میں دو مریضوں کی سیوا میں مشغول تھا۔ پریم مجھے یہاں کھینچ لایا۔ میں اپنے آپ کو اس کام کے لائق نہیں سمجھتا۔ جب سے شوپرشاد جی سے میرا تعارف ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گنگا کنارے رہتے ہیں۔ اس کا پانی پیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کے پاس دوسری گنگا بھی ہے۔ وہ ان کی بھاؤنا (خواہش) اور کلپنا (تصور) کی گنگا ہے۔ اس میں وہ اپنی آتما (روح) کی شدھی (صفائی) کرتے ہیں۔ انہوں نے خواہشات اور تصورات کے گھوڑے بھی بنالئے ہیں۔ ان کے تصورات کے گھوڑوں کو روکنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ ان سے وہ زمین کا چکر تو کاٹ ہی لیتے ہیں۔ آسمان میں بھی گھوم آتے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اس خواہش کو مجسم بنانا چاہیئے۔ ایک جگہ ہندوستان کا مٹی کا نقشہ دیکھا۔ انہوں نے تصورات کے گھوڑوں کو روک دیا۔ اور ہندوستان کے نقشہ کی تصویر قائم کر دی۔ جیسی ان کی خواہش تھی۔ ویسے ہی ماہرین فن مل گئے۔ انہوں نے دستکاروں کو تعلیم دی۔ یہ مندر تعمیر ہوا۔ اس میں دیوی کا بت (مورتی) نہیں ہے۔ بھارت ماتا (مادرِ ہند) کا نقشہ ہے ایشور نے ان کو نیا جیون (زندگی) پردان کیا۔ ان کا تصور بت کی شکل میں ہمارے پاس موجود رہیگا۔ آج صبح جب یہاں وید منتر پڑھے جاتے تھے۔ تب میں یہاں آیا۔ کیونکہ پورن آہوتی بھی میرے ہی ہاتھوں سے کرانی تھی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ وہ

شلوک مُنا جسے میں تقریباً تیس سال سے پڑھتا ہوں۔ وہ شلوک بھارت ماتا کے لئے نہیں بلکہ دھرتی (زمین) ماتا کے لئے ہے۔ اس میں بھوی (زمین) کو وشنوپتنی (وشنو کی بیوی) کہا ہے۔ اس کا وستر (لباس) انوگرہ (رحم) ہے۔ اس کی پیٹھ پر ہم بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں کہا ہے کہ ہے دیوی! پیروں کے سپرش (چھونے) کے لئے تم کشما (معاف) کرو۔ اس کی چھاتی بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ یہاں بھارت ماتا یا بھارت دیش کا نقشہ بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ ہم بھی اسی خواہش سے مندر میں پرویش (داخل) کریں گے۔ کہ سچ مچ یہ ہماری ماتا ہے۔ ہماری اپنی ماتا تو آج رہیگی کل چلی جائے گی۔ مگر زمین کی ماتا نہیں جائیگی۔ اگر جائیگی۔ تو ہم سب کو گود میں لیتی جائیگی۔ وہ تب جائیگی۔ جب گنگا جائیگی۔

یہ مندر سب کے لئے ہے۔ اس میں سب کو آنا چاہیئے۔ شرط یہی ہے۔ کہ ملک کے لئے محبت ہو۔ جس کے دل میں ہمارے ملک (دیش) کے لئے کچھ بھی محبت ہے۔ وہ آوے۔ اس میں یہ بھاؤ (جذبہ) نہیں ہے کہ دوسری جاتی (قوم) یا ملک کے لوگ نہ جا سکیں۔ ایسے جذبہ سے بھرپور یہ مندر ہے تب میں قابل ہوؤں یا نہ ہوں۔ اسے کیوں نہ کھولوں۔

شری پرکاش ایم۔ ایل۔ اے سنٹرل

کانگریس اور مسلمان

کانگریس کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلمان کانگریس کے ممبر بنیں مسلم عوام کے ساتھ نزدیکی تعلق قایم کرنیکی جو تحریک ہو رہی ہے، وہ ہمارے قومی مستقبل کے لئے نہایت ضروری ہے۔ میں اپنے دیگر دوستوں کی طرح مسلم مسئلے سے زیادہ خوفزدہ نہیں ہوں۔ پھر بھی میں یہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں داخل ہوں اس کے متعلق دیگر امور لکھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ یہ مسئلہ ہمارے ہاں کیسے پیدا ہوا؟

ہندوستان کے تاریخی دور

عام طور پر ہندوستانی تاریخ کے تین دور مانے جاتے ہیں۔ ہندو۔ مسلم اور انگریزی دور۔ اگر ہم حقیقی طور پر تاریخی واقعات کی تحقیقات کریں۔ تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ جس وقت ملک کا انتظام انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اس وقت مسلم حکومت ملک میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کا زیادہ حصہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ انگریزوں نے ہندوؤں سے حکومت سنبھالی۔ مگر عام نقطہ نظر سے دیکھنے پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے بعد انگریز آئے۔

ہندو مسلم کشمکش

مسلم حکومت کے خاتمہ اور انگریزی عملداری کے آغاز کے درمیانی دور میں جو ہندو حکومت تھی وہ غیر منظم تھی۔ چاروں طرف لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اور مناسب طریقہ سے مستحکم ہونے کا کافی وقت بھی نہیں ملا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کا یہ ضرور خیال ہے کہ انگریزوں کو ہم سے انتظام سلطنت ملا۔ اس وقت کے ہندو رواجات بھی غیر معین ہیں۔ کسی ہندو کو اس وقت کی یاد نہیں جس سے اسے فخر ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد نے شاندار کارہائے نمایاں کیئے۔ مقابلتاً ہندوؤں کو زمانہ قدیم کی یاد تازہ ہے۔ اس زمانہ کی جسے تاریخ دان ہندوؤں کا دور (Hindu Period) کہتے ہیں۔ انہیں یہ ضرور یاد ہے۔ کہ کئی چھوٹی چھوٹی ہندو سلطنتیں قائم ہوئیں۔ مسلسل جدوجہد ہوتی رہی انفرادی بہادری۔ بُردباری اور قربانی کی مثالیں ملتی گئیں۔ مگر اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں۔

انگریزوں کا جذبہ

قبضہ حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کا جو خیال اور جذبہ رہا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیال سے بھی انہوں نے مسلمانوں سے ہی حکومت حاصل کی ہے۔ گو انہیں سب سے زیادہ جنگ مرہٹوں۔ سکھوں اور نیپالیوں سے کرنا پڑا تھا۔ جو سب ہندو تھے۔ ان کا ابتدائی طریقہ عمل بھی ایسا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیالات میں انہیں مسلمانوں سے اپنی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ اور مسلمانوں کے ہی دل ان کے قبضہ حاصل کرنے سے زیادہ شکستہ ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے سانحات کے بعد جب انگریزوں کی حکومت منظم طور پر ہندوستان میں قائم ہوئی۔ تو وہ ہندوؤں کی طرفداری کرتے تھے۔ اور مسلمانوں

سے خبردار رہتے تھے۔ ان کے اس وقت کے مضامین سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے
کہ وہ مسلمانوں سے خوفزدہ تھے۔

پچاس سال کی ذہنی کیفیت

یہ رجحان تقریباً پچاس سال تک قائم رہا۔ اسی دوران میں اگرچہ ہندوؤں نے ہر طرح سے انگریزی سرکار کی مدد کی۔ مگر وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑتے ہی رہے اور حالات سے سخت غیر مطمئن رہے۔ تب گورنمنٹ کا رُخ بدلا مسلمانوں نے بھی یہ محسوس کیا۔ کہ ہر طرح سے انگریزوں کی تائید کرنے میں ہی ہماری حقیقی بہتری ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ اگر ضرورت ہو۔ تو ہمیں ہندوؤں کی مخالفت کر کے بھی ہر طرح سے گورنمنٹ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ انکا یہ خیال ہوا۔ کہ آزادی کی تحریک مضبوط ہندو قومیت کو قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے انگریزی افسران کو یقین دلایا۔ کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اور ہندوؤں سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔

انگریز اور مسلمان

ایسی حالت میں انگریز یعنی برٹش حکومت نے صاف طور سے مسلمانوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ یہ حالت تیس سال سے چلی آرہی ہے۔ اس کی ایک بہت افسوسناک اور مضبوط مثال یو۔ پی کے سابق گورنر سر ولیم موریس نے دی تھی۔ جب انہوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے محبت آمیز تعلقات تو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی مریم اور داؤد کے ناموں سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہ بیچارے اس وقت سینکڑوں سالوں کے مسلسل جہاد کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ جس سے یورپ کی تاریخ لال ہوئی پڑی ہے۔ اور جو

عیسائیوں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ کرتی رہی ہے۔ اور یورپ کے عیسائیوں کا ٹرکی کے ساتھ جو تعلق رہا۔ اس کا بھی انہوں نے اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا۔ گبن سے ویلز تک کے انگریز تاریخ دانوں کے قول بھی آپ کو یاد نہ آئے۔ اور شیکسپیئر اور سکاٹ وغیرہ کی تصانیف بھی اس وقت آپ کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔

نئی قومیت یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اور ہندو مسلمانوں کے باہمی عناد اور غلط فہمیوں کی موجودگی میں بہت سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ سب کو ایک ہی ملک میں رہنا ہے اور جب یہ حالات ایسے ہیں جن سے بچا نہیں جا سکتا۔ اور کوئی راہِ فرار نہیں۔ تو باہمی امن سے رہنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ لوگ محسوس کرنے لگے ہیں۔ کہ کسی غیر ملکی طاقت پر انحصار کرنے سے مستقل فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس یہ امکان ہے۔ کہ ایسا کرنے سے ہم اور زیادہ مصیبتوں اور مشکلات میں گرفتار ہو جائینگے۔

GIRLS COL LIBRARY 13913

کانگریس قومی جماعت سب لوگ اب یہ دیکھتے ہیں۔ کہ ملک کی صرف ایک ہی قومی جماعت ہے۔ وہ ہے کانگریس۔ جس نے ہر قسم کی تکالیف اٹھا کر بھی اپنی صداقت کا ثبوت دیا ہے۔ جو تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر کے ملک کی آزادی کا پرچم اوپر اٹھائے ہوئے ہے۔ جو بےغرضانہ طور پر وطن کی خدمت کرتی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس ادارہ میں کچھ ایسی کشش آمیز طاقتیں ہیں۔ کہ کتنے ہی مرد و زن بڑے اور چھوٹے اپنا سب کچھ خوشی خوشی اس کے لئے قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چاہے کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ ہم سب ہی اس نتیجہ پر پہنچے ہے

ہیں کہ جو کوئی مستقل فائدہ کی صورت پیدا ہوگی۔ اس سے زیادہ تر قومی مفاد کانگرس ہی اٹھا سکتی ہے۔ اور اس سے ہی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آزادی کی جنگ کو جاری رکھیگی اور ملک کا سر بلند کرتی رہیگی۔

اہلِ اسلام کو دعوت

یہ بالکل مناسب ہے۔ کہ کانگرس مسلمانوں کو اپنے اندر لانے کی سعی کرے۔ پرانی باتیں تو اب فراموش ہو چکیں موجودہ مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔ مستقبل کے امکانات سے تمام فکر مند ہیں۔ اقتصادی اور سیاسی نقطہ نظر سے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سب کی بھلائی ملکر کام کرنے میں اور باہمی محبت اور یگانگت قائم رکھنے میں ہی ہے۔ کانگرس کا کسی خاص جماعت یا فرقہ سے تعلق نہیں کسی مذہب کے خاص حقوق سے متعلق لے دلچسپی نہیں۔ اگر آج ہمارے ملک میں کوئی پبلک ادارہ ایسا ہے جس میں کوئی بھی ہندوستانی صاف دلی سے بلا ہچکچاہٹ شامل ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف کانگرس ہے۔ ان حالات میں جو جد وجہد جاری کی گئی ہے۔ وہ بالکل درست ہے۔ اور مستقبل قریب حوصلہ افزا ہے۔

ہندو مسلم مسئلہ کیسے پیدا ہوا؟ ہندو دھرم اور درشن انفرادی ہے گو اس کی قدیم کتابوں میں عالمگیر مجلسی اتحاد کی موٹے موٹے اصولوں کی بنیاد پر تعمیر شدہ سکیم ملتی ہے۔ مگر در اصل اس کے موجودہ پیرو کار عام میل جول میں اس کے مطابق عمل کرنے کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اور نہ ہی اسے مستقل بنیادوں پر کھڑا کرنے کی کوشش ہی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی مجلسی زندگی کے تنزل پذیر ہونے کے جو جذبات ہمیشہ سامنے رہتے ہیں۔ اس سے اتحاد کے تمام ریزولیوشن اور کوششیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اصلی چار اقوام اب بڑھتے بڑھتے چار ہزار تک پہنچ گئی ہیں

ہندوؤں کی اندرونی تفریق

ہندوؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ ساتھی لوگ معمولی اختلاف پر الگ ہوجاتے ہیں۔ کچھ تو نیا فرقہ بنا کر ہندو ہی بنے رہتے ہیں۔ مگر دوسرے گھبرا اور اکتا کر یا ناراضگی و غصہ کے زیر اثر دوسرے مذاہب میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہندوؤں کی آج یہ حالت ہوگئی ہے۔ کہ ان کے سماج (سوسائیٹی) میں بیوگان۔ اناتھ۔ حاجتمندوں اور مصیبت زدگان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم دوسروں کو معمولی بات پر تکلیف دیتے ہیں۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے افسوسناک حالات میں یہ قدرتی ہے۔ کہ چاہے ہمارے معیار کچھ ہی ہوں۔ کروڑوں ہندو مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔

اسلام کی خصوصیت

حکومت کی توکشش ہوتی ہی ہے حکومت کی تمام اشیا پسند آتی ہیں۔ اگر راجہ کا دھرم مسلمان تھا۔ تو اس کے ماتحت لوگوں کے لئے اس میں دلچسپی تھی۔ بڑے کی بزرگی کا باعث اس کا ظاہرا سلوک سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی کی نقل بھی ہوسکتی ہے۔ دوسرے اسلام بہت ہی جمہوریت پسند ہے۔ افلاس کی وجہ سے کوئی اس کے مطابق قصوروار نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ سے کوئی اپنی مناسب مجلسی جگہ سے محروم نہیں ہوتا۔ مفلس اور متمول اشخاص ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ اور مسجد میں دعا مانگتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ بہت سادہ مذہب ہے۔ وہ بہت تھوڑے کام پر ہی دنیا اور پرلوک دبہشت کے متعلق بہت امیدیں دلاتا ہے۔ انسان کی قدرتی کمزوریوں کو وہ فوراً معاف کر دیتا ہے۔

مسلمان ہندستانی ہی ہیں

چاہے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان باہر سے نہیں آئے ہیں۔ چند ایک مستثنیات کے علاوہ سب ہندوستانی ہی ہیں۔ بہت کم تعداد بالکل صاف غیر ملکی خون سے ہے۔ جو ہندو مسلمان بن کر اپنے پرانے مذہب کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس پر ہمیں حیرانی نہ کرنی چاہیئے۔ انسان کی فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ قدرتی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جسے اس کے سماج (سوسائٹی) نے نکال دیا ہے وہ اسے برا سمجھے۔ اپنے مذہب کو چھوڑنے والے کے لئے اس کا نیا مذہب زیادہ عزیز بن جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ مصیبت میں گرفتار تھا۔ تو اس نے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے قبول کیا تھا جب وہ مختلف فرقوں سے بھری ہوئی دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ تو اس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ایسے فرقہ سے اسے کیوں محبت نہ ہو؟ کیوں نہ نیا پیروکار اپنے نئے مذہب اور احباب کی خدمت کرنے کے لئے بے قرار ہو؟ مصیبت کے زمانہ میں جو کام آتا ہے۔ وہی دوست ہے وہی عزیز ہے جو تکلیف کے دنوں میں ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ تو جانی دشمن ہے؟

مسلم سماج کی کمزوریاں

ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑیگا۔ کہ ایسے حالات میں جن لوگوں نے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ ان کے ذریعہ اس نئے سماج یا فرقہ کو دراصل سیاسی۔ روحانی یا دینوی طاقت حاصل نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمانوں کو ملک میں آئے ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گئے۔ اگرچہ کئی صدیوں تک وہ ایک طرح سے ملک کے مکمل حاکم تھے۔ پھر بھی وہ کمزور اور مفلس ہی بنے رہے۔ ان کے مذہب کے بنیادی اصولوں میں ہی کچھ کمزوریاں ہونگی۔ جس سے ان میں خود ضبطی کا

جذبہ بہت کم ہے۔ گو وہ عارضی طور پر بہت جوش کا اظہار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی سوسائٹی میں مسلمانوں کا جو درجہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ نہیں تھا۔ اقتصادی۔ سیاسی کسی نقطہ نظر سے دیکھا جاتے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی ہی اہمیت دیکھی جاتی ہے۔ کوئی حیرت نہیں کہ اس عجیب نظارہ سے غیر ملکی حاکم خوفزدہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی مسلمانوں کے طرفدار بن گئے۔ کئی اندرونی طریقوں سے وہ مسلمانوں پر زور دینے لگے۔ روح کی بیداری اور ترقی کے ذرائع کا خاص طور پر ان کے لئے انتظام کیا گیا۔ ملازمتیں مختلف اداروں میں ان کے لئے جگہ محفوظ کی گئی۔ ایسے انتظامات سے خاص طور پر جب وہ حکومت کی طرف سے کئے گئے۔ بلا شک مسلمانوں کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

قومیت کا اثر

ہندوؤں کو یہ حالات بہت برے معلوم ہوئے۔ زیادہ ہی زیادہ مطالبات پیش کرنے لگے۔ غیر ملکی نوکر شاہی کو بھی قدرتی خواہش ہوئی۔ کہ سکھ عیسائی وغیرہ اقلیتوں کو بیدار کیا جائے۔ جب سے ان کی حکومت قائم رہے۔ عقلمند مسلمانوں نے اس چال کو سمجھ لیا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا۔ کہ قومیت میں ہی ان کی حقیقی اور مستقل بھلائی پوشیدہ ہے۔ اسی وقت بین الاقوامی حالات نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ بڑی سے بڑی سلطنت بھی تو آخر ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں انسانی زندگی کی لہر ازلی اور ابدی ہے۔ ایسے مسلمانوں نے مناسب سمجھا۔ کہ ہندوؤں سے ہی ملکر ہم آزادی کی لڑائی میں مصروف ہوں۔ اور انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو بھی

جوش دلایا۔ کہ قومی تحریک کو اپنائیں۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس نے حالات سے پورا پورا فایدہ اُٹھانا اپنا اولیں فرض سمجھا۔ اور سب قومی طاقتوں کو منظم کرنا شروع کیا۔

ہندوؤں کا فرض

ایسے حالات میں ہندوؤں کا خاص فرض ہے انہیں ہر طرح سے ایثار سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ سب متحد ہو جائیں۔ ہندوؤں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ ان کی تعداد پچیس کروڑ ہے۔ اس مشترکہ مکان میں وہ بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ اگر کوئی چھوٹا بھائی ضد پر اڑ جائے۔ کہے کہ میرے حق سے زیادہ تم نہ دو گے۔ تو میں اجنبیوں کو بُلا کر گھر لٹوا دونگا یا اس میں آگ لگا دونگا۔ تو بڑا بھائی گھر کی عزت بچانے کے لئے چھوٹے بھائی کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اور نقصان برداشت کر کے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ ہندوؤں کو اسی خیال سے کام کرنا چاہیئے

اقلیتوں کی ضد

اگر کوئی اقلیت اپنے حقوق سے زیادہ کے لئے ضد کرے تو اسے مطمئن کرنا ہی پڑے گا۔ اگر چھوٹا بڑے کو مشتبہ سمجھے تو یہ قدرتی ہی ہے۔ بڑے کا فرض ہے کہ اس کا شک دور کرے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ آگے چلکر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب آزادی مل جائے گی۔ جب کسی باہر کی طاقت کا اندیشہ باقی نہ رہیگا۔ جب کسی غیر ملکی حکومت کا خوف نہ رہیگا۔ تب ملک میں آباد تمام فرقے اپنے حقوق اور فرائض کو سمجھینگے۔ اور اس کے مطابق عمل بھی کرینگے۔

ہمارا فوری فرض

اس وقت اتحاد اور نظام کی خاطر۔ امن اور انتظام کے لیئے۔ اکثریت کو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اگر ساتھ دینے کی قیمت بھی مانگی جائے تو دینی ہوگی

اس سے کانگرس کی بھی طاقت بڑھ سکتی ہے۔ تبھی کانگرس کا نظم سب تسلیم کریں گے۔ اور تبھی سب کے شکوک رفع ہونگے۔ کیا یہ امید کی جائے کہ اس بڑے کام میں ہم سب اپنی اپنی طاقت اور عقل کے مطابق ممد و معاون ہونگے۔ اور اپنی منزل مقصود کے حصول کے لئے مکمل طور سے کوشاں رہینگے۔

ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ

باہمی امداد کی تحریک اور کانگرس

تحریک امداد باہمی (Cooperative Monemand) کا کسانوں کی اصلاح سے گہرا تعلق ہے۔ سچ پوچھا جائے۔ تو یہ تحریک کسان تحریک کا ایک ضروری جزو ہے۔ کسانوں کی تکالیف کو دور کرنا اس کا کم سے کم مقصد ہے۔ مگر اس کا زاویۂ نظر کافی وسیع ہونا چاہیئے۔ جس سے شہری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی یہ اثر انداز ہو سکے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آپ اسے انفرادی تحریک نہیں کہہ سکتے۔

ہمیں کسانوں کی موجودہ حالات پر غور کرنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ ہمارے شریک کار کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے پہلے ہم آپ لوگوں کا دھیان کانگرس کے کسانوں سے متعلق طریقۂ عمل کی طرف

مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا پروگرام ہے جو پچھلے صوبائی انتخابات کے موقعہ پر اپنا کمالی اثر دکھا چکا ہے۔ کانگرس نے جب لکھنؤ کے اجلاس پر دوبارہ "افلاس۔ بیکاری اور دیہاتیوں کے قرضہ کے بوجھ وغیرہ مسائل پر غور کیا۔ تو یہ ظاہر ہُوا کہ اس کی بڑی وجوہات ہمارے یہاں کی کھیتی باڑی کے پرانے طریقے اور بیں ڈالنے والے لگان کا رواج ہیں۔ پچھلے سالوں میں اناج کا نرخ کم ہو جانے سے کسانوں کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اور کسانوں کے مسئلہ کا حل کرنا اور مشکل ہو گیا۔ کانگرس کی قرارداد میں بالکل ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ کہ اس مسئلہ کو مکمل طور پر سلجھانے کے لئے آخر کھیتی باڑی کے طریقوں اور لگان کے رواج میں تبدیلی اور انگریزی ملوکیت پرستی سے ملک کو آزاد کرانا ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوگا۔ کہ سرکار اس بات کو محسوس کرے۔ کہ دیہات میں رہنے والے بیکار آدمیوں کو کام دینا اس کا فرض ہے

کسانوں کی ایک عام شکائیت ہے کہ زمینداروں اور تعلقہ داروں کے ہاتھوں ہمیشہ ان کی تباہی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے سوشلسٹ بھائی یہ نہیں چاہتے کہ ایسے قانون بنائے جائیں۔ جن کی وجہ سے کسانوں میں پھیلنے والے انقلابی رجحانات میں خلل واقع ہو۔ مگر ہمارا مطلب تو وہی ہے۔ جو کانگرس کا ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ مستقبل میں انقلابی تبدیلیوں کا انتظار کرنے کی بجائے جبکہ پرائیوٹ دولت کا نام و نشان مٹ جائیگا۔ کسانوں کو جلد سے جلد امداد پہنچا کر انکی تکالیف کو جہاں تک ممکن ہو سکے۔ دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ ہے قرض کا۔ اس سلسلہ میں کانگرس نے جو سفارش کی ہے۔ وہ بالکل مبنی بر انصاف ہے۔ کانگرس نے قرض کے علاوہ بقایا لگان اور مالگذاری کے متعلق بھی سفارش کی ہے۔ آج ہم لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں۔ کہ قرض کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔

اصل قرض سے دوگنے سے زیادہ وصول کرنے کا حق مہاجنوں کو ہرگز نہ دیا جائے اور سابقہ قرض کی ادائیگی کے لئے مہاجنوں کو مجبور کیا جائے کہ روپیہ میں سے آٹھ آنے لیکر ہی وہ صبر کریں۔ مگر اس طرف کسی کی توجہ ہی نہیں جاتی۔ کہ آخر اتنے روپے ادا کرنے کے لئے کسانوں کے پاس کیا ذرائع ہیں۔ کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ جس سے وہ قرضہ کی ادائیگی کے قابل ہو سکیں۔

کسانوں کی قابل رحم حالت

کسانوں کی تکالیف کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ ان کی زمینوں میں اس قدر پیداوار نہیں ہوتی کہ اخراجات کے علاوہ کافی منافع ہو۔ اور اسی وجہ سے وہ طرح طرح کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ جہاں زمینداری سسٹم رائج ہے وہاں تو بیگار کا بھی رواج آج کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن کو دور کرنے کے لئے فوراً دھیان دیا جانا چاہیئے۔ لگان اور مالگذاری وصول کرنے میں جیسے مظالم اور تشدد سے کام لیا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لوگوں کو یاد ہو گا کہ ۱۹۱۷ء میں جب گاندھی جی نے چمپارن میں نیل کی کھیتی کرنے والے کسانوں کی تکالیف کی تحقیقات کی تھی۔ تو معلوم ہوا تھا۔ کہ نلہے صاحبوں کی طرف سے کسانوں سے چونسٹھ قسم کے غیر قانونی ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ جن مقامات پر رعیت واری سسٹم رائج ہے وہاں کے کسانوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔ ان مقامات پر ہر تیس سال کے بعد زمینوں کا دوبارہ بندوبست ہوا کرتا ہے۔ اور ٹیکسوں کا بوجھ عموماً پونے انیس فیصدی بڑھ جاتا ہے۔ درمیان میں ہونیوالے اضافہ اور دوسرے قسم کے لگان کی چرچا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا تو صاف ہے۔ کہ کسانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ اس میں جلد از جلد کمی ہونی چاہیئے۔ ادھر جنگل قانون اور نمک قانون نے ملک کے غریبوں کی حالت اور بھی بدتر

بنا دی ہے۔ قدرت نے ان پر مہربانی کر کے انہیں جو اپنا تحفہ دیا ہے۔ ان سے بچارے غریبوں کو محروم کر دیا گیا ہے۔ جنگل قانون کے باعث مویشیوں کو چراگاہوں کی سہولت نہیں ملتی۔ اور لکڑی مہنگی ہو جاتی ہے۔ نمک قانون نے مچھلی پکڑنے کی تجارت کو ختم کر دیا ہے۔ اور انسانوں اور جانوروں دونو کو کمزور بنا دیا ہے۔

کانگرس کا پروگرام

دو باتیں اور رہ جاتی ہیں۔ جن کے لئے حکومت ذمہ وار ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ سرکاری بجٹ میں دیہات سدھار کے لئے جتنی رقم خرچ کئے جانے کا انتظام ہونا چاہئے وہ نہیں ہوتا۔ کسانوں کی مجلسی۔ اقتصادی اور تمدنی ترقی کے لئے جتنی رقم الضافاً مقرر ہونی چاہئے۔ اتنی نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے یہ شکایت اب تک قائم ہے۔ کہ ہمارے یہاں سڑک، ہسپتال اور سکول نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ لائبریری، کھیلنے کے لئے میدان۔ بنک۔ انشورنس وغیرہ کی سہولیات بھی ضروری ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسانوں کو مغربی تہذیب کے حملے سے بھی بھاری نقصان ہوا ہے۔ مشینوں کی ایجاد نے ہندوستانی دستی صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے۔ جس سے ہمارے دیہاتی بھائی جو دستکاری کا کام کرتے تھے۔ اپنے پیشے کو چھوڑ کر کھیتی باڑی کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اور اس طرح زمین پر زیادہ ہی زیادہ بوجھ بڑھتا گیا۔ اور مالی نقطۂ نظر سے زراعت نقصان کا پیشہ بن گیا۔

اس لئے کانگرس نے ان باتوں کو دھیان میں رکھکر ہی اپنی زراعتی سکیم تیار کی ہے۔ جس میں ایک طرف اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ کہ کسانوں کی کی مالی حالت بہتر بنائی جائے۔ جس سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں

اور بیخوفی سے اپنے شہری حقوق کو استعمال میں لاسکیں جبکہ غریب کسان کے پیٹ میں بھوک کی آگ لگ رہی ہے۔ وہ بلاشک سب سے پہلے روٹی کی باتیں کرنا پسند کریگا اور بعد میں ووٹ کی۔ بیچارہ مقروض کسان یا تو اپنے زمیندار کے ہاتھ کا کھلونا بنا رہتا ہے یا مہاجن و شاہوکار کے ہاتھ کا۔ جس غریب کسان پر دن رات ظلم ہوتے رہتے ہیں۔ جس پر طرح طرح کے قانونی اور غیر قانونی اور غیر قانونی ٹیکسوں کے بوجھ لدے ہوئے ہیں۔ اسے بھلا ستیہ گرہ اور سوراجیہ کی باتیں کرنے کا صبر کہاں؟ اور ستیہ گرہ اور سوراجیہ کی جنگ کے دوران میں آنے والی مصیبتوں کے پہاڑ کا سامنا کرنے کی اس میں طاقت کہاں؟ اس لئے کانگرس نے دیہات سدھار کی طرف دھیان دیا ہے۔ اور دیہات کو ہی قومی بیداری کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور ہمارے کسان اور مزدور ہی اس کے بنیادی ستون ہیں

تحریک امداد باہمی (کواپریٹو)

ایک زمانہ تھا جب سیاست اور اقتصادیات ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں۔ مگر وہ زمانہ گزر گیا اب تو کسانوں کی مالی حالت اور کسانوں کی زندگی کا زراعتی پہلو ہی امداد باہمی تحریک کی بنیاد ہے۔ ایک وقت تھا جب ناقدوں کی نظر میں کانگرس اور یہ تحریک اگر ایک دوسرے کے مخالف نہیں تو کم سے کم ایک دوسرے سے بہت دور ضرور ملنے جاتے تھے۔ لیکن اب زمانہ کی رفتار کے ساتھ ہی لوگوں اور کانگرس کے زاویہ نظر میں بھی فرق پڑ گیا ہے۔ ہاں کواپریٹو ڈیپارٹمنٹ کا نقطہ نگاہ بھی بدل گیا ہے یا نہیں۔ ہم تسلی بخش طریقے سے نہیں کہہ سکتے۔ کانگرس کو آج بھی حکومت مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس کے تعمیری پروگرام میں اُسے سیاست کی بُو آتی ہے

فرقہ وارانہ اتحاد اور ہریجن اصلاح کو بھی وہ سیاسی چال سمجھتی ہے اور نشیلی اشیاء کے خلاف ہونے والے پرچار سے وہ کیوں نہ گھبرائے جب کہ بجٹ کے گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے اس سے اس کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔ رہی کھدر کی بات۔ اس کے مفاد کو کبھی کبھی وہ بھی تسلیم کرتی ہے۔ مگر جو سرکار چرخے کے پرچار اور اس کی ترقی کے لئے توجہ اور روپیہ صرف کرتی ہے پتہ نہیں وہ چرخے کے پرچار سے کیوں گھبراتی ہے۔ کواپرٹیو ڈیپارٹمنٹ اگر جلاہوں کی امداد کرسکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسی اصول کے مطابق وہ چرخے پر سوت کتائی کی کیوں حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔

دیہاتی صنعتوں کا دوبارہ اجرا

چرخہ پرچار اور سوت کتائی کے ساتھ ہی دیہاتی صنعتوں کا سوال آتا ہے۔ کواپرٹیو ڈیپارٹمنٹ تباہ شدہ اور تقریباً مردہ دیہاتی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ کانگرس نے جب دیہاتی دستکاریوں کو زندہ کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ اور اس پر عمل کرنے لگی تو سرکار اسے شک کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ہی اس کے شکوک بھی بہت کچھ دور ہو چکے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دیہاتوں کی ترقی کے لئے کواپرٹیو ڈیپارٹمنٹ کیوں نہ کچھ کرے۔ یہ ایسی نمائش کا انتظام کرسکتا ہے جہاں آگرہ۔ مراد آباد۔ پورولیا۔ وشنوپور۔ لکھنؤ۔ پٹنہ یا یوں کہیئے۔ کہ تمام ملک کے مختلف حصوں میں ہمارے کاریگروں کے ذریعہ بنائی گئی اشیاء بکری کے لئے رکھی جائیں۔ جن سے اس کا کافی پرچار ہو اور ملک کی مختلف دستکاریوں کی حوصلہ افزائی ہو۔

تعلیم کا کام:۔ تحریک امداد باہمی (کواپریٹو) کا کام ملک کے صنعتی

میدان تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ عوام میں تعلیم کا پرچار کرنا ان کا بھی اتنا ہی ضروری فرض ہے۔ جتنا دیگر لوگوں کا۔ مگر ابھی تو کوا پریٹو تعلیم اور کوا پریٹو سکیم کے ذریعہ اشاعت کی گئی صفائی کی حالت غیر موجود ہے اس کے لئے خود دیہاتیوں کو سب سے پہلے کام شروع کرنا چاہیئے۔ اور ایک دفعہ کام شروع ہونے پر اس کام میں پوری مدد دینا کوا پریٹو ڈیپارٹمنٹ کا فرض ہے۔

ہریجنوں کی امداد

کوا پریٹو ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہریجنوں کو سہولت دینے کے لئے خاص طور پر انتظام ہونا چاہیئے۔ اس وقت ہریجنوں کو خاص طور پر اجتماعی طریقہ پر زمین حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طریقہ پر ہریجنوں کو زمین نہ دی جائے بلکہ اجتماعی شکل میں دی جائے۔ کیونکہ انفرادی ملکیت ہونے سے ان میں سرمایہ دارانہ رحجان پیدا ہو سکتا ہے۔ اور وہ زمین کو اچھے داموں پر فروخت کر کے روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جو یقیناً نقصان دہ ہو گا۔ اس لئے ہریجن کنبوں کی مختلف ٹولیوں کی کوا پریٹو سوسائٹیوں کو زمین دی جانی چاہیئے۔ ان خاندانوں کے ہر ایک فرد کو زندگی بھر اس سے مفاد اٹھانے کا حق حاصل ہو گا۔ مگر اسے فروخت کرنے کا نہیں۔ زمین کی کھیتی بھی کوا پریٹو طریقہ کے مطابق ہی ہونی چاہیئے۔

کانگرس اور کوا پریٹو تحریک

آج ہریجنوں کے سامنے یہ ایک مسئلہ ہے کہ رہنے کے لئے جھونپڑیاں کہاں بنائیں۔ خاص طور پر صوبہ مدراس میں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے

کواپریٹو سوسائیٹوں کے ہاتھ میں ۔ جس طرح محض ریزولیوشن پاس کرنے سے ہی سوراجیہ نہیں مل جاتا ۔ اسی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرنے سے دیہات سدھار کا کام نہیں ہو سکتا ۔ اس کے لئے روزبروز سخت دھوپ ، پانی اور کیچڑ میں کام کرنا ہوگا ۔ اور اس کام کو منظم طریقہ پر کرنے کے لئے ہمیں موجودہ انتظام سے ضرور فایدہ اٹھانا چاہیئے ۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کانگریس اور کواپریٹو تحریک کے درمیان تعلق قایم کیا جائے ۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں کم سے کم آدھ درجن ایسے برگزیدہ کارکن ضرور موجود ہیں ۔ جن کو کانگریس اور کواپریٹو تحریک دونوں کے ساتھ یکساں دلچسپی ہے ۔ ان دونوں کے درمیان رشتہ قائم کرنے کے لئے ان لوگوں کے تعاون سے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ اس طرح دو نوں ہی مل کر دیہات سدھار کا جو پروگرام مرتب کرینگے ۔ وہ ضرور فایدہ مند ہوگا ۔ اور اسے کانگریس کمیٹی اور کواپریٹو کانفرنس کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح دیہات سدھار کے کام کو کافی تقویت ملیگی

شری یت سبھاش چندر بوس

کسانوں کے کچھ مسائل

میں اس مختصر سے مضمون میں ہندوستان کے موجودہ دیہاتی مسائل کا کوئی آخری حل سامنے نہیں رکھونگا ۔ صرف چند ایک مسائل کا ذکر کرونگا ۔ اکثر

یہ ہوتا ہے۔ جیسے منطق میں۔ کہ مسائل کے محض ذکر سے ان کے حل کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔ یہی بات ہندوستان کے دیہات کی اقتصادیات کے ساتھ ہے۔

ہندوستان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اراضیات کے مروجہ اصول سب جگہ کے لئے یکساں نہیں۔ اس لئے جہاں اتنا اختلاف ہے۔ وہاں ہم نے یکسانیت پیدا کرنی ہے۔ اور پھر اس میں بنیادی تبدیلیاں کرنی ہیں۔ تاکہ ہماری اراضیات کے مسائل مجلسی انصاف کے اصولوں اور موجودہ زمانہ کی ضروریات سے میل کھا سکیں۔

بنگال۔ بہار و اڑیسہ کے صوبوں اور یو۔ پی و مدراس پریذیڈنسی کے چند حصوں میں ہم زمینداری اور تعلقہ داری کا رواج اپنی ننگی شکل میں دیکھتے ہیں۔ بنگال اور اس سے ملحقہ صوبوں میں جہاں استمراری بندوبست ہے۔ زمینداری سسٹم کی ایک اصلاح شدہ شکل بھی دیکھنے میں آتی ہے جس کے مطابق زمینداروں کے ذریعہ ادا کئے جانے والا مالیانہ تو مقررہ ہے۔ مگر کسانوں کے ذریعہ لیا جانیوالا اراضی کا لگان تبدیل ہوتا رہتا ہے یو۔ پی۔ مہاراشٹر و گجرات میں ایتواری سسٹم رائج ہے۔ وہاں بنگال اور کے ملحقہ صوبوں جیسی زمینداری نہیں۔

غیر ممالک میں

اب زمینداری کے رواج کے سیاسی پہلو پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام ترقی پسند اصحاب اس بات سے متفق ہیں۔ کہ زمینداری سسٹم کو ختم کر دینا چاہیئے۔ سوال صرف یہ ہے کہ بغیر تلخی۔ نفرت اور خون خرابے کے اس رواج کو کیسے ختم کیا جائے؟ ہندوستان سے باہر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ غیر سوشلسٹ ممالک میں بھی زمینداری

سسٹم کو ہٹایا جا رہا ہے۔ پچھلے سال آئرلینڈ کی سیاحت کے دوران میں مجھے آئرش فری سٹیٹ کے مسئلہ اراضیات پر وہاں کے وزیر اراضیات سے تبادلہ خیالات کرنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ سرکار کس طرح بڑے بڑے زمینداروں کی اراضی جو پہلے بطور چراگاہ استعمال کی جاتی تھی۔ خرید رہی ہے۔ اور کسان ملکیت سسٹم (System of Peasant Proprietor ship) کے ماتحت کھیتی باڑی کے قابل بنا رہی ہے۔ یہ زبردستی بیدخلی کا نہیں بلکہ معاوضہ کا معاملہ ہے۔ گذشتہ سالوں میں مغربی پرشیا میں بھی اسی طرح کے ایک طریقہ کو استعمال کیا گیا تھا۔ جہاں حکومت نے جنکروں (پرشیا کے رئیس) کی دیوالیہ جائیدادوں کو اپنے قبضہ میں کر کے کسانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے خلاف روس میں زمینداری سسٹم کا خاتمہ "زبردستی بیدخلی" کے ذریعہ کیا گیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے دوران میں جب روس میں کچھ دن گڑبڑ رہی۔ تب اراضیات کے خواہشمند کسانوں نے زمینداری سسٹم کو تباہ و برباد کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ جب بالشویک سرکار قائم ہوئی۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ زمیندار غائب ہو گئے۔ اور ان کی جگہ کسان مالکان نے لے لی۔ خیر حکومت یہ کاغذی اعلان کر کے خاموش ہو گئی۔ کہ" اراضی ملک کی ہے"۔ یعنی اراضی پر حکومت کا حق ہے۔ کسی خاص فرد کا نہیں۔ لیکن تقریباً بارہ سال تک وہ آنکھیں بند کئے کسان ملکیت کے سسٹم کو برداشت کرتی رہی۔ بارہ سال کے بعد سرکار کی طرف سے اجتماعی کھیتی اور کسان مالکوں (جو روس میں کلکوں کے نام سے مشہور ہیں) اور آہستہ آہستہ بیدخل کرنے کی تحریک شروع کی گئی۔

مشکل اور نازک مسئلہ

بنگال جیسے صوبوں میں صرف زمینداری سسٹم ہی نہیں۔ بلکہ اراضیات کے متعلقہ قواعد و ضوابط نہایت پیچیدہ ہیں۔ کیونکہ وہاں کسانوں کے حقوق کے کئی درجے ہیں ایسے صوبوں میں زمینداری کو ہٹانے اور خاص اراضیات کے متعلقہ قانون نافذ کرنے کے علاوہ موجودہ طریقہ کو بھی کافی سادہ اور آسان بنانا پڑیگا اور کسانوں کے ان درمیانی درجوں کو ختم کرنا ہوگا۔ دراصل زبردست انقلاب کے بغیر ان بڑے مسائل کا حل سوچنے میں ہندوستان کے ریاستدانوں کو بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑیگی۔

قرضداری اور چکبندی

یہ سچ ہے کہ زمینداری سسٹم کے نقائص کے علاوہ ہمارے کسانوں کے سامنے قرضداری و نقصان دہ چکبندی کے دو بڑے مسائل ہیں۔ اس بات سے سب اتفاق کرتے ہیں۔ کہ کسانوں کی قرضداری دُور کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ اور اس کام کے لئے روپیہ کہاں سے لایا جائے۔ یہ مسئلہ بھی حل ہونا آسان نہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ قرضداری کو دُور کرنے سے ہی تو یہ سوال حل نہیں ہوتا۔ مان لیجئے۔ آپ ایک جھٹکے میں کسانوں کی قرضداری دُور کر دیتے ہیں۔ لیکن بیس یا پچاس سال میں اس کے دوبارہ شروع ہونے کو کیسے روکا جائے۔ کسانوں کو کچھ زمین دینا پڑیگی۔ جس کی پیداوار سے وہ اپنے کنبوں کا گذارہ کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں نقصان دہ چکبندیوں کا خاتمہ کرنا پڑے گا۔ اور جب تک یہ ضرررساں چکبندیاں بند نہیں ہونگی۔ تب تک نہ تو اجتماعی کاشت ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی سائینٹفک طریقہ سے عالمگیر زراعت۔ اس لئے زمینداری سسٹم

کو دُور کرنے کے بعد زمین کی نئے سرے سے پیمائش کرنی ہوگی۔ اور ایک نیا بندوبست کرنا پڑیگا۔ جس میں نقصان دہ چکبندیاں نہیں رہینگی۔

وراثت میں زمین کی تقسیم

پھر دوسرے مسائل ہیں۔ جن کو پہلے سے دھیان میں لاکر حل کرنا ہوگا۔ مان لیجئے نیا بندوبست ہو جاتا ہے۔ تمام نقصان دہ چکبندیاں دُور ہو جاتی ہیں لیکن مستقبل میں ہم کسانوں کو قرضدار و فضول خرچ ہونے سے کیسے روک سکینگے۔ بلا شک ہم یہ قانون بنوا سکتے ہیں۔ کہ کوئی کسان زمین کو رہن نہ کرے اور نہ ہی فروخت کرے۔ اس سے کچھ حد تک اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کے لئے مجبور ہونگے۔ لیکن اگر اس کے ذمہ ایک بڑا کنبہ ہے تو وہ کیا کریگا۔ جب وہ مرجائیگا۔ اور اس کی زمین لڑکوں کو مل جائے گی۔ تب کیا ہوگا۔ یہ پیچیدہ مسائل ہیں۔

برتھ کنٹرول

فرانسیسی کسان ان مسائل کو اس طرح حل کرتے ہیں۔ غیر قدرتی ضبطِ تولید کے ذریعہ وہ بہت مختصر کنبہ کی پرورش کا انتظام کر لیتے ہیں۔ انجام کار وہ اپنی زندگی مزے سے گذارتے ہیں۔ تب زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہوتی (مگر یہ دستور نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے فرانس کی آبادی میں اضافہ ہونا بند ہو گیا۔ جبکہ جرمنی جیسے ممالک کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے) اس لئے دیگر ممالک کے کسانوں کے مقابلے میں فرانسیسی کسانوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ وہ خوشحال ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۲ء میں جب میں جنیوا میں تھا۔ ایک فرانسیسی خاتون (سوشلسٹ) مجھ سے ملیں۔ جو کسی وقت سوویٹ طریقہ کی بہت

معتقد تھیں۔ اس نے کہا۔ روس کے سفر کے بعد میرا جوش بہت کم ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے۔ کہ اراضی کی قومی وجوہ اور اجتماعی زراعت کے باوجود روسی کسانوں کے مقابلہ میں فرانسیسی کسانوں کی حالت بہت اچھی ہے"۔ اس پر میں نے کہا۔ کہ آپ کو آج کے روسی کسانوں کا زار کے وقت کے کسانوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور سوویٹ سرکار کو اپنے کسانوں کی حالت سدھارنے کے لیئے ابھی اور وقت لگانا چاہیئے۔ بات یہ ہے۔ کہ فرانسیسی کسان برتھ کنٹرول (ضبطِ تولید) کے ذریعہ مقروض ہونے اور زمین کی تقسیم سے محفوظ رہتے ہیں۔

ہندوستان میں کسانوں کی بڑھتی ہوئی قرضداری۔ کھیتوں کی فروخت و رہن وغیرہ رکھنا قانوناً روک سکتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں حکومت اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ کسانوں کے لیئے ضروری سامان۔ مویشی۔ اوزار۔ بیج وغیرہ مہیا کرنا پڑیگا۔

مستقبل میں ہم اراضی کی تقسیم کیسے روک سکینگے۔ کسانوں کو برتھ کنٹرول کے لیئے مجبور کرنا مشکل ہے۔ چاہے یہ ضروری ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں اگر بیٹے زمین کے وارث ہونگے۔ تو زمین کے ٹکڑے ہونے ضروری ہو جائینگے۔ اور اراضی کے تقسیم ہو جانے سے کسانوں کی مالی حالت خراب ہو جائیگی۔ اس لیئے یا تو اراضی پر انفرادی ملکیت کے رواج کو ختم کرنا ہوگا۔ یا (اگر زمین کسانوں کی ملکیت ہے) سرکار کو جب بھی کوئی فوت ہوگا۔ تب ہی ایک نیا بندوبست کرنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اراضیات کے متعلقہ قانونِ وراثت میں بنیادی تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ تاکہ باپ کی موت کے بعد اراضی خود بخود بیٹوں کے ہاتھوں میں نہ جا سکے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے۔ کہ اگر اراضی کی ایسی چکبندیاں جن سے فائدہ کی بجائے نقصان ہو۔ ہٹا دی جاتی ہیں۔ اور اگر مندرجہ بالا طریقے سے قانون وراثت میں بھی تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ تو آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اراضی سے محروم ہو جائے گا۔ اور ملک میں بیکاری کا مسئلہ زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لیگا۔ سائینٹفک طریقہ سے کی گئی کاشت آج کل کے مقابلہ میں زیادہ آدمیوں کا پیٹ بھر سکتی ہے لیکن اس سے بیکاری کا مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ تو دستکاریوں کو ترقی دینے سے ہی حل ہو سکیگا۔ اس لئے زراعت کا مناسب انتظام تبھی ممکن ہو سکتا ہے۔ جبکہ دستکاریوں کی بھی ترقی ہو۔

زندہ جاوید شہید شری گنیش شنکر ودیارتھی

اِنقلاب کی لہر

تاریخ فرانس میں ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۲ء کے سال خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن دو سالوں میں فرانسیسی سوسائیٹی میں بہت اُتھل پتھل ہوئی بہت سی تعمیری اور تخریبی تحاریک شروع ہوئیں۔ نپولین کے بعد فرانس میں پُرانے شاہی خاندان کی قائمی ہوئی۔ لوگ تھکے ہوئے تھے۔ اُنہیں آرام کی ضرورت تھی۔ سب کے دِل میں ایک بات تھی۔ اور وہ یہ کہ امن قائم ہو۔

فرانس کے پہلے انقلاب سے لیکر نپولین کے زوال تک ۔ لوگوں نے بڑے بڑے سانحات ۔ بڑی بڑی فتوحات ۔ بڑی بڑی ہستیاں دیکھی تھیں ۔ اب ان سے ان کا دل بھر چکا تھا ۔ اب تو معمولی معمولی باتوں سے ہی دل مطمئن ہو جاتا تھا نپولین کی جگہ کسی چھوٹے ہوٹے رئیس ہی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہونے کے لئے تیار تھا ۔ بہت لمبا سفر طے کر چکے تھے ۔ صبح سے سفر شروع ہوا تھا ۔ پہلی منزل پر مرابو سے ملاقات ہوئی ۔ دوسری پر روب سپیر سے اور تیسری پر نپولین بونا پارٹ سے ۔ اب شام ہو چکی تھی ۔ چلنے والے تھک گئے تھے ۔ ان میں میں سے ہر ایک کا جی یہ چاہتا تھا ۔ کہ بچھونا ملے اور آرام سے لیٹ جائیں عقیدت ۔ انقلاب ۔ بہادری ۔ خواہشات ۔ دولت اور شہرت کی آرزو سب ہی عروج پر تھے ۔ اور ان سب کے عقیدتمندوں کے دل میں اب صرف ایک ہی خواہش تھی ۔ کہ آرام سے وقت گذارنے کا موقعہ ملے ۔ ادھر آرام کی خواہش تھی ۔ ادھر انقلاب اور جنگ کے باعث عوام کو جو حقوق حاصل ہو گئے تھے ۔ وہ ان کی حفاظت کے لئے واضح اعلان کے خواہشمند تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ اس قسم کے مطالبات کیا ہی کرتے ہیں ۔ مگر سچ تو یہ ہے ۔ کہ حکمران کیا دیتے ہیں ۔ حالات کے باعث ہی لوگوں کو کچھ سہولیات ملتی ہیں ۔ نپولین کے بعد فرانس کے پرانے شاہی خاندان کی جو ''بوربون'' نام سے مشہور تھا ۔ قائمی ہوئی ۔ اس خاندان کے دل سے یہ بات دُور نہیں ہوئی تھی ۔ کہ ملک کو کوئی حق حاصل نہیں ۔ تمام حقوق خدا کی طرف سے صرف انہیں ہی حاصل ہیں ۔ آج ہم پبلک کو جو کچھ دیتے ہیں ۔ کل اُسے واپس لے سکتے ہیں ۔ لوئیس اٹھارویں کے اعلان میں رعایا کے جن حقوق کی وضاحت کی گئی تھی ۔ اس کے متعلق اس شاہی خاندان کا ہی یقین تھا ۔ کہ یہ ہم نے ہی سب کچھ دیا

ہے۔ اور ہم جب چاہیں۔ انہیں واپس لے لیں۔ اسی لئے عوام کی ترقی کے کاموں سے اس شاہی خاندان کا دل دُکھتا تھا۔ لوگوں میں بیداری پیدا ہونے سے انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ عوام سے یہ بات پوشیدہ نہ رہی۔ شاہی خاندان کو اپنی طاقت اور بزرگی کا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ نپولین کے مٹ جانے کے بعد آخر فرانس کو ہماری ہی ماتحتی قبول کرنی پڑی۔ اپنی گذشتہ عظمت کی وجہ سے "بوربون" کا شاہی خاندان اس وقت فرانس کو بھی اپنا عقیدتمند پُجاری سمجھتا تھا۔ مگر اب رنگ دگرگوں تھا۔ فرانس صرف اس خاندان کا نہ تھا۔ فرانس گذشتہ بائیس سال تک بغیر اس شاہی خاندان کے بھی اپنا گذارہ کرتا رہا تھا۔ پھر جن اشخاص نے نپولین کی سلطنت کو ختم کیا تھا اور بوربوں خاندان کو جس طرح واپس لائے تھے۔ اسی طرح وہ اُسے پھر اکھاڑ بھی سکتے تھے۔ مگر شاہی خاندان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے خدا سے عطا کردہ حقوق ہی کے غرور میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے پبلک کے حقوق کو کچلنا چاہا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ حقوق نہ تھے بلکہ رعائتیں تھیں جو راجہ نے عطا کی تھیں۔ مگر دراصل وہ جنہیں رعائتیں کہتے تھے۔ وہ عوام کی فتح کے نشانات تھے۔ جنہیں وہ رعایا کی زبردستی اور شرارت کہتے تھے۔ وہ دراصل رعایا کے حقیقی حقوق تھے۔ جب بوربوں کے شاہی خاندان نے اپنی طاقت کے نشہ میں فرانس کے لوگوں کے حقوق چھیننے چاہے۔ اور آرڈیننس (خاص احکامات) نافذ کئے۔ جب پبلک مشتعل ہوگئی۔ اور آخر اس نے ۱۸۳۰ء میں بادشاہ چارلس دہم کو گدی سے اتار دیا۔ اور بوربوں خاندان کو ملک سے نکال دیا۔ لوگوں نے اس وقت حیران کن فراخدلی کا ثبوت دیا۔ کہیں کمینہ پن نہ تھا۔ کہیں تشدد سے کام نہ لیا گیا۔ جو کچھ ہوا۔ امن اور

سنجیدگی کے ساتھ۔ کسی نے اس خاندان کی بے عزتی نہیں کی۔ اس کے جانے کا کسی کو غم نہ تھا۔ مگر اس کے اوصاف اور افعال پر کسی نے پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کے لیئے ان کی عزت بھی ہوتی رہی۔ دراصل یہ صداقت کی فتح تھی۔ سچائی ہمیشہ خوبصورت اور آرام دہ ہوتی ہے۔ جس بات میں سچائی نہیں ہوتی۔ چاہے وہ کتنی ہی عام کیوں نہ ہو۔ آخر وہ گندی اور خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اس کا اندازہ لگانا ہے اور آج صدیاں گذر جانے پر "میکیاویلی" اور اس کے اصولوں کی شکل کو دیکھیں۔

"میکیاویلی" نہ ہی شیطان ہے اور نہ ہی گندہ انسان۔ وہ تو اس وقت بھی یورپ کی حقیقی تصویر کھینچنے والا ہے۔ اس کی باتوں میں سچائی نہیں ہے اسلیئے آج اس کی شکل کتنی خوفناک ہے۔ سوسائیٹی میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ہونا چاہیئے۔ اسی سچائی کے فیصلہ کا تو سب جھگڑا ہی ہے۔ اس کشمکش کا خاتمہ کرنا نیک مقاصد کو انسانی طرزِ عمل کے ساتھ ملا دینا۔ طرزِ عمل میں صداقت اور صداقت میں عمل کو داخل کر دینا ہی تو عالموں کا کام ہے مگر گیانیوں اور یوگیوں میں بہت فرق ہے۔ اس زمانہ کے یوگیوں کو ماہر سیاست کہا جاتا ہے۔ آج جہاں قابلیت ہے وہاں تنزل بھی ہے۔ جہاں آپ قابل انسان دیکھیں۔ وہاں یہی سمجھیں کہ قابل اشخاص سے صرف درمیانے درجے کے آدمیوں سے مُراد ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ماہر سیاست کا مطلب کبھی کبھی ملک سے بغاوت کرنے والا ہو جاتا ہے۔ ان ماہرین سیاست کے خیال کے مطابق ۱۹۳۰ء کا انقلاب جسم کی نسوں کے کٹ جانے کے برابر ہے۔ ان نسوں میں فوراً پٹی بندھ جانی چاہیئے۔ ان اصحاب کو عوام کی خواہشات کی قطعی کوئی پروا نہیں۔ وہ اپنے مطلب کی باتیں بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انقلاب

کے بعد پبلک کی، خاص طور پر ان عوام کی جن پر کسی رئیس کی حکومت رہی ہو، سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کہیں سے فوراً ایک شاہی خاندان قائم کیا جائے۔ جس سے ملک میں امن رہے۔ تازہ زخم مندمل ہو جائیں۔ اُجڑے ہوئے گھر بس جائیں۔ ان کی نظروں میں شاہی خاندان ہی سب بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ شاہی خاندان بھی وہ ایسا ڈھونڈتے ہیں جو قدیمی ہو، اور ساتھ ہی انقلاب سے جسے ہمدردی ہو۔ کسی بااثر حوصلہ مند شخص کو وہ راجہ نہیں بنانا چاہتے کسی فرد کی نہیں بلکہ وہ خاندان کی تلاش کرتے ہیں۔ اور خاندان بھی ایسا جو جھک کر آنے کے لئے تیار ہو۔ یہ قابل آدمیوں کا فن ہے۔ اس سے وہ ایک ڈھیلے سے دو چڑیوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ ہاری ہوئی بازی کو جیت کر دکھلاتے ہیں۔ چلتی ہوئی گاڑی کے پہیے میں پتھر کا روڑا اٹکاتے ہیں۔ ترقی کی رفتار کو روک دیتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ ادھر ادھر اُڑنے والوں کے پر اور بازو کتر دیتے ہیں۔ ابھرتی ہوئی امنگوں کو ورغلا کر ختم کر دیتے ہیں۔ اور عوام کی طاقت کے منبع کو دوسری طرف گھما کر نکما کر دیتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں ایسا ہی ہوا۔ یہ انقلاب درمیان میں ہی روک دیا گیا، ترقی کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ ملک کے خوشحال لوگوں نے ایسا کیا۔ خوشحال لوگوں اور یوں۔ یوں نے ملکہ آرلینس خاندان کا ایک فرد ڈھونڈ نکالا۔ وہ تھا لوئیس فلپ۔ لوئیس فلپ فرانس کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ دھوم دھام سے اس کا راج تلک ہوا۔ جو کچھ ہوا، وہ مناسبت کے سخت خلاف تھا۔ مناسبت کا اس میں کوئی خیال ہی نہ کیا گیا تھا۔ اس لئے جہاں جہاں اس وقت سچائی اور مناسبت کے جذبات کام کر رہے تھے۔ وہاں وہاں ان جذبات نے اونچی آوازمیں اس سانحہ کی مذمت کی، مگر یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ کہ وہ صرف مخالفت کر کے ہی رہ گئے۔

لوئیس فلپ کو بادشاہ بننے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں مارنے پڑے۔ وہ تو بادشاہ بنایا گیا۔ وہ راجکمار تو تھا ہی۔ بادشاہ بن جانا اس نے اپنا حق اور فرض سمجھا۔ اس نے جو کچھ کیا۔ نیک نیتی سے کیا۔ ادھر عوام کے حقوق کے اصول کی بنیاد پر اس کی جو مخالفت ہوئی۔ وہ بھی درست تھی۔ حکومت اور عوام کی طاقتوں کا مقابلہ تھا دونو اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ ان دونو کی کشمکش سے سوسائیٹی پسی۔ مگر آج سماج کے لئے جو بات تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کل وہی اس کے لئے آرام کا باعث بن جاتی ہے۔ در اصل ان دونو فریقوں میں سے ایک ہی سچا ہے۔ مگر جو سچائی پر نہیں۔ اس میں بھی نیک نیتی ہے۔ قصور کس کا سمجھا جائے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ سلسلہ واقعات ہی سے ایسی سخت کشمکش ہوا کرتی ہے۔ آغاز سے ہی لوئیس فلپ کی مخالفت ہوئی۔ چاروں طرف سے اس کی شدید مخالفت ہونے لگی۔ واقعات کے ذریعہ خدا پُراسرار زبان میں اپنی خواہش ظاہر کیا کرتا ہے۔ اس زبان کو لوگ اپنے اپنے طریقہ سے پڑھا کرتے ہیں۔ بہت ہی تھوڑے لوگ اس کے صحیح مطلب کو سمجھتے ہیں باقی لوگ تو اس کے اُلٹے سیدھے مطالب نکال کر ان کی اشاعت کرتے ہیں نسمجھدار لوگ جب اپنے مطلب کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ تب انہیں دکھائی دیتا ہے کہ اس مطلب اور اصلیت کے تو سینکڑوں غلط معنے ہر جگہ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اور لوگ اپنی اپنی ڈفلی سے اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔ دقیانوسی خیالات کے لوگ اس نئے طریقہ کے مخالف بنتے ہیں۔ وہ انقلاب کا مطلب بتاتے ہیں "غدر"۔ انقلاب تو دراصل غدر سے الٹی چیز ہے انقلاب کے تحت عوام غدر نہیں مچاتے۔ راجہ غدر کرتا ہے ہر ایک انقلاب ایک قدرتی چیز ہے۔ اس کی مناسبت ہمیشہ اسی میں پوشیدہ رہتی ہے۔ اور جو کسی طرح بھی چاہے وہ بدنام کیا جائے اور چاہے وہ خون سے لت پت ہو جائے مٹایا نہیں جا سکتا۔ انقلابات اتفاقیہ سانحات کا نتیجہ نہیں یہ ضرور

پیدا کرتے ہیں۔ انقلاب مستوی شکل سے قدرتی شکل کی طرف آتا ہے۔ انقلاب صرف
اس وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا اور انقلاب کا ہونا
ضروری تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے انقلاب کے وقت دقیانوسی خیالات کے لوگوں نے بھی
حملے کئے۔ وہ بولے اگر انقلاب ہی ہے۔ تو پھر نیا بادشاہ کیوں بنایا جائے۔ ان
لوگوں کی یہ مخالفت دراصل انقلاب سے محبت کی وجہ سے نہ تھی۔ انہیں تو صرف
حملہ کرنا مطلوب تھا۔ مگر ان کا حملہ حالات کی جڑوں پر ہوا۔ ان کی حالت ٹھیک
ان اندھے آدمیوں کی سی تھی جنہوں نے بغیر دیکھے ہی ٹھیک نشانہ لگایا۔ ادھر
عوام جمہوریت پسند تھے۔ جن کا حملہ بالکل ٹھیک تھا۔ اور جو یہ ٹھیک ٹھیک کہتے
تھے۔ کہ ایک شاہی خاندان کو ہٹا کر دوسرے کو قائم کرنا بیوقوفی ہے۔ اس بات سے
تو سنہ ۱۹۳۰ء کا دیوالیہ پن ثابت ہوتا ہے۔ اسی جدوجہد کے درمیان نوتیس نلب کی
حکومت دو نہ ملزمت سے دھکے کھا رہی تھی۔

بابو راؤ وشنو پراڑکر

بیکاری کی وجہ

آگرہ یونیورسٹی کے کنوکیشن کے موقعہ پر سر شاہ محمد سلیمان نے جو تقریر کی تھی۔
اس کے متعلق کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیکاری کا
تذکرہ کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں۔ بیکاری سے نہ صرف تعلیمیافتہ بلکہ ان پڑھ عوام

بھی سخت تنگ ہیں۔ یہ بہت تیزی سے بڑھنے والی آبادی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہمارے ان فالتو آدمیوں کے لئے دنیا کے ویران اور سنسان حصوں میں بھی جگہ نہیں ہے ہم اپنے نوجوانوں کو تعلیم دیں یا نہ۔ بیکاری اس وقت تک دور نہ ہوگی۔ جب تک پیدائش پر قابو نہ پایا جائے۔ اس کے بعد آپ نے دستکاریوں کو ترقی دینے کا مشورہ دیا ہے۔ دیہات سدھار کے لئے جو کوشش کی جا رہی ہے۔ اسکی تعریف کرتے ہوئے شہروں میں بھی ایسی ہی کوشش کرنے کی صلاح دی ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ "دیسی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور تیار شدہ مال فروخت کرنے کے لئے منظم سکیم کی ضرورت ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو ان دستکاریوں کی تعلیم دینے کے لئے جنہیں زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں اول درجہ کے ماہرین کی ضرورت ہے۔" سر شاہ محمد سلیمان کے ان خیالات سے ہر سنجیدہ ہندوستانی متفق ہوگا۔ مرض کا علاج اور تشخیص دونو ہی ٹھیک ہیں۔ خاص طور پر ہمیں تو وہ وجہ بہت ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ جو آپ نے بتائی ہے اگرچہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ بیکاری کا واحد سبب آبادی کا بڑھنا ہے۔ گویہ ایک بڑی وجہ ضرور ہے۔ غلامی سے پیدا شدہ، ہماری سیاسی اور مالی مجبوریاں بھی بیکاری کا سبب بن رہی ہیں۔ مگر ہم اسے اول نمبر نہیں دے سکتے۔ سیاسی اور اقتصادی نقطہ نظر سے ہندوستان کم سے کم ڈیڑھ صدی سے غلام ہے۔ اور بیکاری گذشتہ چند سالوں کی کھیتی ہے۔ اگر غلامی ہی اولیں سبب ہوتی۔ تو بیکاری اس سے بہت پہلے یعنی ہندوستان میں انگریزی حکومت شروع ہونے کے دس بیس سال بعد پیدا ہو گئی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بیکاری آدمیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ہے۔ اور غلامی سے پیدا شدہ ہماری اقتصادی بدحالی اس کو زیادہ تیز کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

آج کل سکولوں اور کالجوں میں تاریخ جس نقطہ نظر سے پڑھائی جاتی ہے۔
اس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے۔ کہ ہمارے زیادہ تر تعلیم یافتہ بھائی ہمارے اس قول پر
حیرانی کا اظہار کرینگے۔ کہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کو ہم ڈیڑھ سو برس کی ہی کیوں
سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند الفاظ اور کہنا ضروری ہے۔ ملک اس وقت غلام
کہلاتا ہے۔ جب دوسرے ملک کے حکمران اس پر حکومت کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے
ہندوستان میں مسلم حکومت کا زمانہ غلامی کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمان باہر سے
ضرور آئے۔ اور ان میں سے کچھ تو لوٹ مار کرنے اور مندر توڑنے و مسمار کرنے کی
غرض سے آئے تھے۔ اور اس شیطانی فعل کے مرتکب ہو کر اپنے وطن کو واپس لوٹ
گئے۔ انہوں نے یہاں سلطنت قائم نہیں کی۔ جو یہاں حکومت کرنے لگے وہ یہیں
آباد ہو گئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کا اپنے وطن سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اس لئے
سیاسی نقطہ نظر سے ان کی حکومت غیر ملکی نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ ہی وہ دور ہندوستان
کی غلامی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ ہندوؤں کے لئے انتہائی ذلت کا تھا۔ اس
زمانہ میں مذہبی مظالم بھی ہوئے۔ اور ہندوؤں کی آزادی، اور حکومت کے ساتھ
ساتھ ان کی دولت بھی مسلمانوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ ہندوؤں کے لئے یہ زمانہ
شرمناک۔ تکلیف دہ اور انتہائی ذلت آمیز تھا۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں
حیرانی صرف اس بات کی ہے کہ دونو مذاہب کے اب تک الگ رہنے اور باہمی
عدم اعتماد کے باعث یہ دونو تیسری طاقت کے غلام ہو گئے ہیں۔ پھر بھی گذشتہ
دور کی تلخ اور میٹھی یاد بالکل محو نہیں ہوتی۔ اس وقت ہندوستان غلام ہے۔ کیونکہ
ایک غیر ملک کی حکومت اس پر قابض ہے۔ محمود غزنوی، محمد غوری۔ احمد شاہ اور
نادر شاہ وغیرہ نے ہندوستان کو بار بار لوٹا۔ مگر ان کی لوٹ کی تمام رقم اس
رقم کے برابر نہیں ہو سکتی۔ جو غلام ہندوستان کو انگریزی سلطنت کی وسعت کے

لئے لڑی جانے والی جنگوں پر خرچ کرنی پڑتی ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے وقت ہندوستان
کا روپیہ غیر ممالک میں نہیں جاتا تھا۔ مگر آج فوج اور حکومت۔ سوداگری اور
تجارت کی شکل میں ظاہرا اور اندرونی طور پر ہر سال قومی آمدنی کا تقریباً
چوتھائی حصہ غیر ممالک میں جا رہا ہے۔ اس کے بدلے میں ہمیں غیر ملکی ماہرین
ملتے ہیں۔ ہندوستان میں گویا ماہرین ختم ہو گئے ہیں۔ انگریزی سپاہی ہندوستان
کی حفاظت کے لئے یہاں آ کر اڈہ جماتے ہیں۔ اور ہندوستانی حفاظت خود اختیاری
اور فوجی تربیت وغیرہ سے قطعی محروم ہیں۔ بدیشی مال یہاں خوب آتا ہے۔
اور سستا فروخت ہوتا ہے اور ہندوستانی بچوں کو کوئی کام نہیں ملتا۔

اس غلامی اور گھناؤنی حالت میں ہم اقتصادی طور پر بالکل بیکار ہیں
ہمارے ملکوں کا انتظام غیر ملکی لوگ کرتے ہیں۔ ہمارا اسٹیٹ بنک غیروں کے ہاتھ
میں ہے۔ ہماری نکات پر اجنبیوں کا قبضہ ہے۔ ہماری تجارت اور دستکاریاں
کئی آئینی پابندیوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔ اس لئے ناظرین دیکھیں گے۔ کہ تمام
ملک کی مالی حالت سدھارنے کے جتنے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ وہ سب غیر ملکی
لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس پر بھی ستم یہ ہے۔ کہ انتظام اور فوج کا خرچ کم کر کے
دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے رقم بچانا ہمارے قبضۂ قدرت
میں نہیں۔ اس سے معلوم ہوگا۔ کہ غلامی ہماری بیکاری کا نہ صرف جزوی
سبب ہے بلکہ وہ اسے دور کرنے میں ایک رکاوٹ ہے۔ مگر جیسا اوپر کہا گیا
ہے۔ یہ اولیں سبب نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو بیکاری انگریزی سلطنت کے
مستقل طور پر قائم ہو جانے کے چند سالوں کے بعد سے ہی ظاہر ہو جاتی۔ مگر
ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس یہ صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ مردم شماری
میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے۔ بیکاری بھی زیادہ ہی زیادہ ہوتی جا رہی ہے

افسوس کی بات ہے۔ کہ اس طرف ہمارے رہنما دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ محکمہ انصاف
کے اونچے عہدہ پر فائیز ہوتے ہوئے بھی سر شاہ محمد سلیمان نے اس موضوع کا
تذکرہ ایک یونیورسٹی کے کنوکیشن کے موقعہ پر کیا ہے۔ اس کے لئے ہم آپ کو
مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آبادی کا اضافہ ہمارے نزدیک بیکاری کا
اولین سبب ہے۔ جو اسے ثانوی وجہ سمجھتے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں
اولین ہو یا ثانوی۔ سبب ضرور ہے۔ اور اسے دُور کرنے کی سعی کرنا ہر ایک
سنجیدہ انسان کا فرض ہے۔

بھیک مانگنا اور غلامی

پُرانی کہاوت

उत्तम खेती, मध्यम बान
निषिध सेवा भीख निदान ॥

سب کاموں میں خیرات مانگنا سب سے بُرا بتایا گیا ہے۔ مگر اس
کی ایک دوسری شکل بھی ہے۔ ہمارا قدیم معیار ہے کہ جو اپنے علم اور ریاضت سے
سوسائیٹی کی خدمت کرتے ہیں۔ انہیں خیرات سے اپنا پیٹ بھرنا چاہیئے۔ یہ نہایت
عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور آج بھی ان کا ویسا ہی احترام ہوتا
ہے۔ دراصل ہماری خیرات ایسے ہی نیک انسانوں کی خدمت کے لئے تھی۔ مگر اب
اس کی شکل بگڑ گئی ہے۔ اس وقت خیرات یا تو خاص قوم کے افراد کو یا خاص
آشرم کے لوگوں کو یا بغیر سوچے سمجھے شہرت حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔
بے غرضانہ دان کم ہوتا ہے۔ اور مستحق آدمیوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ ایک
مشہور شلوک ہے

दरिद्रान भर कौन्तेय प्रयच्छेश्वरे
धनम । व्याधितस्यौषधं पथ्यं नीरुजस्य
किमौषधैः ॥

جس کا مطلب یہ ہے۔ ہے ارجن و یدھشٹر۔ مفلسوں کی امداد کرو۔ امیر

کو مت دان دو۔ مریض کو ہی دوا دینے سے آرام ہوتا ہے۔ تندرست آدمی کو دوا سے کیا فائدہ ہوگا۔ الٹا نقصان ہوگا۔ ہو بھی رہا ہے۔ دان کے روپیہ کا استعمال بھیانک افعال ناکردنی میں ہوتا دیکھا جاتا ہے۔ دان میں دی ہوئی گائے قصائی کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ بغیر سوچے سمجھے دان دینے کا یہ برا نتیجہ ہے مگر سوسائٹی اس قدر عمل سے خارج ہو گئی ہے۔ کہ آنکھیں رکھتی ہوئی بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ صرف لکیر کی فقیر بنا رہنا چاہتی ہے۔ مگر یہ لکیر بھی بہت پرانی نہیں ہے۔ قدیم کتابوں میں بغیر سوچے سمجھے مستحق آدمی کا امتحان کئے بغیر دان دینے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا شلوک میں صرف مفلسوں کی امداد کا حکم نہیں ہے۔ ساتھ ہی واضح الفاظ میں"

मा प्रयच्छेश्वरे धनम ॥

" بھی کہا گیا ہے۔ مگر اس پر کون غور کرتا ہے۔ بغیر غور کئے دان دیا جاتا ہے۔ اور وہ سوسائٹی کے لئے نقصاندہ ہوتا ہے۔ اچھے کام کا برا انجام یہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ کیونکہ بغیر سوچے سمجھے کیا ہوا اچھا کام بھی برا ہی ہوتا ہے۔

ہماری اس لاپرواہی کا ہی یہ نتیجہ ہے۔ کہ فقیروں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس ملک میں دس فیصدی ایسے آدمی ہیں۔ جو سوسائٹی کے خون پسینے کی کمائی پر اپنا گذارہ کرتے ہیں۔ اور بہت آرام سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو راہ گیروں کو گھیر کر، مکانوں کے دروازوں پر چلا کر اور کبھی کبھی مکانوں میں گھس کر، مندروں میں آنے جانے والے لوگوں کو پکڑ کر بھیک مانگا کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگ روزانہ تنگ ہوتے ہیں۔ مگر ان سے پیچھا چھڑانے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ سوال جیسا آسان معلوم ہوتا ہے۔ ویسا دراصل نہیں ہے۔ یو۔ پی اسمبلی میں سٹری

دیونرائن بھرتیہ نے اس مطلب کا ایک بل پیش کیا تھا۔ کہ سرکار کو قانون
بنا کر راستے میں بھیک مانگنا قابل سزا جرم قرار دینا چاہیئے۔ گو یہ بل پاس
نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ہونا چاہیئے تھا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بھیک مانگنے
والوں میں چند ایک واقعی مفلس اور مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی پرورش کا انتظام کیئے
بغیر راستے میں بھیک مانگنا بند نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی مستحق اور مفلس آدمی ان
میں ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت کلکتہ میں ملا ہے۔ جہاں ایک آدمی بغیر دانہ پانی کے سڑک
کی پٹڑی پر گر کر مر گیا۔ کاشی (بنارس) میں سڑکوں پر بھوک اور بیماری سے عاجز آئے
ہوئے اناتھوں (یتیموں) کو کس نے نہیں دیکھا۔ اگر ان کا بھیک مانگنا بھی بند کیا
جائیگا۔ تو موت کے علاوہ ان کے لئے اور کوئی راستہ نہ رہ جائیگا۔ بھیک ممنوع قرار
دینے سے پہلے شہر بہ شہر اور تحصیل بہ تحصیل اناتھ آلیہ اور اس قسم کے دیگر ادارے
کھولنے کی ضرورت ہے۔ جہاں مفلسوں اور محتاجوں کو اناج۔ کپڑا اور آرام ملے اور
بیکاروں کے لئے کام مہیا ہو۔ مگر کیا یہ اس ملک میں ممکن ہے۔ جہاں نصف سے
زیادہ آدمی پیٹ بھر کھانا نہیں کھاتے۔ اور ۲۵ فیصدی بیکار ہیں۔ یہ سوچنے کی
بات ہے۔ اس لئے جب تک تمام ملک کی (صرف چند امیروں کو چھوڑ کر) مالی حالت
نہیں سدھاری جاتی۔ اس وقت تک اسے ممنوع قرار دینا ممکن نہیں۔ ہاں یہ مانتے
ہیں۔ اور ہر ایک سنجیدہ انسان کو ماننا ہی پڑیگا۔ کہ جس قدر آدمی بھیک مانگتے
ہیں۔ وہ سب مفلس اور محتاج نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جن کا
پیشہ ہی یہ بن چکا ہے۔ اور ان میں بھی کچھ ایسے ہیں۔ جن کا پیشہ چوری کرنا۔ ٹھگی
کرنا اور معزز گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کرنا ہے۔ ان کو سزا دینے میں۔ ان
کی یہ عادت چھڑانے میں ہی سوسائیٹی کا بھلا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے۔ کہ حقیقی
محتاجوں کے لئے موت کا دروازہ کھولے بغیر سماج کی ان جونکوں کا منہ کیسے بند

کیا جائے۔

وسیع النظری سے دیکھا جائے۔ تو یہ سوال ملک کے افلاس کا ہی ایک حصّہ ہے۔ بھیک بھی سوسائیٹی سے ہی ملتی ہے۔ تو بھیک بند کر کے اناتھ آلیہ کھولنا سماج کے لئے ناممکن نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات سچ ہے۔ مگر یہاں سماج کی بے علمی روکاوٹ بنتی ہے۔ لوگ قدیمی رواجات کے مطابق خیرات کرینگے کبھی خواہش سے اور کبھی تنگ آکر اور کبھی کبھی ڈر کر راہ چلتوں کو۔ دروازے پر چلانیوالوں کو یا گھر میں زبردستی گھس آنے والے فقیروں کو تو بھیک دیدینگے۔ مگر اناتھ آلیہ کے لئے چندہ اور محتاجوں کی پرورش کے لئے چھوٹا سا قرضہ نہ دیں گے۔ اس رجحان کو حکومت قانون بنا کر اُلٹا نہیں سکتی۔ سرکار عوام کی مالی حالت کو سدھارنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مختلف صوبوں میں یہ کام شروع بھی ہو گیا ہے۔ مگر صوبائی حکومتوں کے اختیارات اس سلسلہ میں محدود ہیں۔ اس لئے وہ ان سے باہر نہیں جا سکتے۔ اور اس کام میں پوری کامیابی نہیں ہو رہی۔ مرکزی حکومت اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اخراجات کم کرنے میں بھی اور کام کاج مہیّا کرنے میں بھی۔ مگر وہ خود ایک غیر ملکی حکومت کی نوکر ہے۔ خود کچھ نہیں کر سکتی۔ اور مالک غیر ملکی ہونے کے باعث ان کا نقطہ نظر بھی غیر ملکی ہے۔ کچھ دن ہوئے مرکزی اسمبلی نے اوٹاوہ کا سمجھوتہ نامنظور کر دیا تھا۔ مگر سنٹرل حکومت نے زبردستی اسے تب تک کے لئے اسے اس بدقسمت ملک کے سر پر لاد دیا۔ جب تک برطانیہ کے ساتھ نیا تجارتی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ مرکزی حکومت کے غیر ملکی زاویہ نظر کی یہ ایک مثال ہے۔ ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے ملک کی حالت میں اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس طرح غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ بھیک مانگنے کا سوال بھی دراصل ہماری غلامی کے بڑے سوال کا ہی ایک جزو ہے۔ جب تک ہم غلام ہیں۔

بھیک مانگنے کا سوال بھی ہمارے ساتھ ہی چھٹتا ہے گا۔

شری وجے لکشمی پنڈت

مُعاشرتی زندگی میں اِنقلاب

ہندوستانی عورتیں گھر کی دیویاں ہیں۔ پیدائش سے ہی وہ اپنے خاندان کی محبت کے درمیان پرورش پاتی ہیں۔ ہر شخص ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور دنیا کے بیش قیمت اور مقدس سرمایہ کی طرح ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔

مگر تہذیب کے اس دور میں آدمیوں کے اس قدر دھیان دینے اور آرام پہنچانے کی کوشش کے باوجود بھی انہوں نے پابندیوں کو توڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر کسی ملک کی عورتیں مردوں کے مقابلہ میں پیچھے ہیں۔ تو یہ امر فیصلہ شدہ ہے۔ کہ وہ تہذیب کی دیوار کو مستقل بنیادوں پر تعمیر کرنے کے قدرتی ذرائع سے محروم ہے۔

دنیا کی تاریخ کے آغاز سے ہی انسانوں نے کمزوروں کو مذہبی ہتھیاروں کے ذریعے اپنے تابع میں رکھا ہے۔ مغربی عورتیں اس بندھن کو روز بروز توڑتی جا رہی ہیں۔ مگر ہندوستان کی عورتیں ابھی تک پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہیں ہندوستانی عورتوں کی پرورش باہری (بیرونی) دنیا سے لاعلمی کے ماحول میں ہوتی ہے۔ ہندوستانی لڑکیاں اپنے والد کی دولت ہیں۔ وہ انہیں شادی کے

موقعہ پر داں دے دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی دولت بن جاتی ہیں اور ان کی تمام زندگی عقیدت اور خدمت کے کاموں میں صرف ہوتی ہے۔ بھگتی یگ نے عورتوں کے دلوں پر محو نہ ہونیوالا نقش چھوڑا ہے۔ ان میں منطق اور دلائل کی طاقت باقی نہیں رہی۔ اور اپنی ذمہ داری کو دوسروں کے کندھے پر ڈالنے میں انہیں مسرت ملتی ہے۔ سماج نے عورت کو اس کے خاوند کا سایہ بنانا چاہا اور وہ بن گئی۔

مگر دنیا کروٹ لے چکی ہے۔ قدیم زمانہ کے خیالات والی عورتیں بھی انقلاب کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسری طرح کی عورتیں لے رہی ہیں آزادی کے پہلے تجربہ کا انجام چاہے جیسا ہو مگر اسے اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔

تاریخ کے موجودہ دور میں تہذیب پر خاص طور سے مردوں کا ہی قبضہ رہا ہے۔ اور عورتوں نے کسی کسی جگہ مقدس گھر کو صرف سماج کا ایک خوبصورت اور باعزت حصہ بننے کے خیال سے چھوڑ دیا ہے۔ مگر زیادہ عرصہ تک وہ خوبصورتی کی چیز کی طرح نہیں رکھی جا سکتی۔

مردوں کی طرح عورتیں بھی انسانی تہذیب کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ آج وہ مردوں کی روزی کے ذرائع پر قبضہ ہونے کے خلاف ہی نہیں لڑ رہی ہیں بلکہ تہذیب پر مردوں کا جو اکیلے ہی اختیار ہے۔ اس کی بھی مخالفت کر رہی ہیں۔ کیونکہ ایسی کوئی تہذیب ہو ہی نہیں سکتی۔ جس میں مردوں اور عورتوں کا مساوی حصہ نہ ہو۔ بغیر دونوں کی مشترکہ کوشش کے کسی بھی قوم یا ملک کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ مردوں اور عورتوں کی مشترکہ آزادی کے حصول کی کوشش کے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عورتوں کو مردوں کے ساتھ باہمی تعاون اور اعتماد کے جذبات کے ساتھ منزل مقصود کی طرف گامزن ہونا چاہیئے۔ اسے مساوی طریقہ پر زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کو مرتب کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ہندوستان میں اتحاد اور ارتقائی ترقی کا حصول ہو سکتا ہے۔

آچاریہ کرپلانی

کھدّر اور اشتمالیّت

آج کل ہر طرف اشتمالیت (سوشلزم) کا چرچا ہے۔ تمام مقامات پر سوشلسٹوں کے ادارے بڑی سرعت سے کھل رہے ہیں۔ یہ ہوا صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں چل رہی ہے۔ سوشلزم موجودہ زمانہ کی لہر ہے دنیا کے بہت سے مشہور عالموں کو اس نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ سوشلزم کے مخالف فاسزم اور نازی ازم بھی آج کل سوشلزم کا لباس پہن کر اور اس کی شکل میں ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ کیا کھادی کو بھی مناسب طریقہ سے سوشلزم کی ہی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن تحاریک کا ایک ہی مقصد انسانی قوم کی ترقی ہو۔ ان میں کوئی باہمی کشمکش باقی نہیں رہنی چاہیئے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔

سوشلزم کی اصلیت

اس مسئلہ کے منطقی اور سائنٹیفک مطالعہ کے لئے ہمیں یہ بہت اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ سوشلزم کا اولیں مقصد اور اصلیت کیا ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں پہلے سے ہی کوئی عقیدہ فرض نہ کریں۔ اور غیر جانبدارانہ طریقہ پر غور کریں۔ تو ہم یہ بلاشک تسلیم کریں گے۔ کہ دھرم (مذہب) برہمچریہ (تجدید) پریوارک جیون (معاشرتی زندگی) راشٹر (ملک) ڈیوسائے واد (صنعت۔ حرفت کا سوال) وتجارت اور اس قسم کے دوسرے سوال جنہیں اس وقت عام آدمی اور ادھورے تعلیم یافتہ لوگ سوشلزم سے ہی متعلق سمجھتے ہیں۔ دراصل بنیادی طور پر اس سے تعلق نہیں رکھتے۔

سوشلزم کا راز دراصل اس کے منافع بازی کے (surplus value) اصول میں دھٹیک ہوا غلطم موجود ہے۔ اسی منافع بازی کے ذریعہ ہی عوام کو پونجی پتی (سرمایہ دار) لوٹتے ہیں۔ یہی منافع بازی فائدہ۔ لگان۔ سود وغیرہ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ایسے پیشوں کو جس میں منافع بازی یعنی نفع۔ لگان یا سود کی گنجائش نہیں۔ سوشلزم کے اصولوں کے مطابق ہی ماننا چاہیئے۔ کوئی پیشہ سوشلزم کے اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کے امتحان کے لئے یہ جاننا ضروری نہیں ہے۔ کہ اس پیشہ کا منتظم یا سرپرست خدا کی ذات پر یقین رکھتا ہے یا مادہ پرست ہے یا مرد و عورت کے نقطہ نظر سے ایک خیال کو مانتا ہے یا دوسرے کو یعنی صنعت و حرفت (Industrialisation) پر اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ سوشلزم کے اصول کو تسلیم کرتا ہو۔

کھادی میں سوشلزم

کھادی کی صنعت میں نہ نفع کی گنجائش ہے نہ لگان۔ سود اور فائدہ کی۔ تمام آمدنی کام کرنیوالوں کی ہی جیب میں جاتی ہے کسی دوسرے فریق کو چاہے وہ دراصل کام کرتا ہو۔ یا محض خیالی مددگار ہو۔ کچھ نہیں دیا جاتا۔ کام کرنیوالوں کی تنخواہوں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کچھ اعداد و شمار اسے اور واضح کردیں گے۔ بننے والے کی ماہوار آمدنی اوسطاً تیرہ روپیہ سے پندرہ روپیہ تک ہے۔ دھوبی بارہ سے پندرہ روپے تک۔ رنگساز پندرہ سے تیس روپے تک اور بڑھئی پچیس سے تیس روپے تک مہینے میں کما لیتے ہیں۔ کاتنے والے کی آمدنی ضرور کم ہے۔ مگر کاتنا تمام دن کا کام نہیں ہے۔ یہ یہ تو صرف خالی وقت کا استعمال ہے۔ دوسری طرف کھڈی کے چلانے والوں کا معاوضہ بھی پچیس روپے ہے۔ گو ان میں سے بہت اعلےٰ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں۔

ملک کا سرمایہ

منافع بازی کے اصول کے نتیجہ کے طور پر ہی سوشلسٹوں نے تمام آمدنی کے ذرائع کو ملک کا سرمایہ بنانے کا اصول قائم کیا ہے۔ جہاں تک کھادی کا تعلق ہے۔ چرخہ اور کھادی ہی آمدنی کے ذرائع ہیں۔ ان کو ملک کا سرمایہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کا خرچ اتنا کم ہوتا ہے۔ کہ ہر دیہاتی اس کا خرچ برداشت کرسکتا ہے۔ جہاں کوئی دیہاتی کام کرنا چاہتا ہے۔ مگر چرخہ اور کھڈی نہیں خرید سکتا۔ وہاں چرخہ سنگھ جو پبلک کا ادارہ ہے۔ اس کی مدد کرتا ہے۔ آمدنی کے یہ ذرائع دراصل قومی ذرائع سے کسی طرح کم نہیں۔

سرمایہ بھی

آمدنی کا دوسرا ذریعہ سرمایہ ہے۔ یہ بھی چرخہ سنگھ کے ہاتھ میں ہونے کے باعث ملک کی جائیداد ہے۔ یہ ایسی پبلک جائیداد ہے۔ جس پر نہ لگان ملتا ہے۔ اور نہ ہی سود۔ کھدر پیدا کرنے والے جو تھوڑے سے بہت ذاتی

کاروبار ہیں۔ انہیں بھی چرخہ سنگھ کے ذریعے قائم شدہ اصولوں کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ ان کے حساب کتاب اور قیمتوں کی تقرری پر چرخہ سنگھ کی نگرانی اور انتظام رہتا ہے۔ انہیں چرخہ سنگھ کے قائم کردہ اصولوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں اتنے ہی نفع پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جس سے وہ اپنی معمولی تنخواہ نکال سکیں۔ دراصل کھادی کا جملہ کاروبار ہی سوشلزم کا ایک تجربہ اور اسی کے اصولوں کے امتحان کا طریقہ ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ موجودہ غیر ملکی حکومت کے مقابلہ پر دیسی سرکار قائم ہو جائے۔ تو کسانوں کے فائدہ کے لئے قومی حکومت ہی کھادی کے قومی کاروبار کو منظم کرے گی۔

کھادی تحریک کی بنیاد

سوشلزم کی دلیل کی بنا ظاہرا واقعات کا مطالعہ ہی ہے آج چاہے ہندوستانی سوشلسٹ مغرب سے آئے والے سوشلزم یا بالشوزم سے متعلق لٹریچر کو کتنا ہی فائدہ مند کیوں نہ سمجھیں۔ یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ کہ سوشلزم کے تمام اصولوں کی حقیقی اور ٹھوس واقعات پر مبنی ہے۔ یہ صداقت پسند ہیں۔ تمام سوشلسٹ فلسفیوں کا یہ دعویٰ ہے۔ مگر کسی طرح کے پہلے قائم کردہ خیالات قدیم جدید تاریخی۔ دھارمک یا فلسفیانہ یا سائنٹفک نتائج پر اس کی بنیاد قائم نہیں اس کی بنیاد تو سات لاکھ گاؤں میں ہونے والے روزمرہ کے تلخ واقعات پر ہے ہونس کسانوں اور مزدوروں کی مصیبت زدہ و تکلیف دہ زندگیوں پر ہے۔

چرخہ اور انقلاب

سوشلزم دیگر باتوں کے علاوہ انقلاب بھی چاہتا ہے۔ چرخہ بھی نہ صرف خود گھومتا رہتا ہے بلکہ دیگر فلسفیانہ انقلابات کا بھی محرک ہے۔ ان پڑھ عوام تشدد نیز اتھل پتھل کو ہی انقلاب سمجھتے ہیں۔ دراصل انقلاب خیالات کی اصلاح۔ صفائی اور تنظیم ہیں۔

خیالات کی رد و بدل یا زاویہ نظر کی تبدیلی میں ہے۔ اس نقطہ نظر سے کھادی کی تحریک نے جس قدر انقلاب ہر پہلو سے کیا ہے۔ اتنا کسی اور تحریک سے نہیں ہوا۔ جس میں ہم عزت سمجھتے تھے۔ اب اس میں بے عزتی سمجھنے لگے ہیں۔ جس میں پہلے بعزتی تھی۔ اب اس میں عزت نظر آنے لگی ہے۔ پہلے کی عمدگی اب بُری دکھائی دینے لگی ہے۔ پہلے کی بدصورت چیز میں ہم حُسن کی تلاش کرنے لگے ہیں۔ خوبصورتی آرٹ، جمالیات اور صحت سب ہی کھادی کی وجہ سے تبدیل ہو گئے ہیں جس نے صرف عوام کے ہی نہیں بلکہ جماعتوں کے بھی اقتصادیات کے متعلق خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

پنڈت سُندر لال

گاندھی ازم اور سوشلزم کا مُقابلہ

گاندھی ازم اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں۔ گاندھی اور لینن دونو بڑے آدمی اور انسانی قوم کے خدمت گذار ہیں۔ ریاضت اور تکلیف برداشت کرنے میں لینن گاندھی جی سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ دونو میں اختلاف ہے۔ مگر یکسانیت بھی بہت ہے۔ کارل مارکس دنیا کے برگزیدہ اشخاص میں سے ایک تھا۔ اور مظلوم انسانوں کا سچا ہمدرد تھا۔ وہ موجودہ زمانہ کے رشی تھے۔ ابھی تک گاندھی ازم عالم وجود میں نہ آیا تھا۔ میں گاندھی جی کے قریب رہتا ہوں۔ مگر میں گاندھی

جی کو ٹھیک سمجھتا نہیں۔ اصل میں گاندھی ازم نام کا کوئی واضح فلسفیانہ یا مالی طریقہ کار نہیں ہے۔ سوشلزم اس سے زیادہ واضح ہے۔ دنیا میں کتنی اقسام کا سوشلزم ہے۔ میکڈانلڈ۔ ہٹلر۔ لینن۔ سٹالین سب ہی سوشلسٹ کہلاتے ہیں۔ گاندھی ازم اور سوشلزم دونوں کی خواہش ہے۔ کہ عوام کے ہاتھ میں طاقت آجائے۔ جو لوگ گاندھی جی کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ ان سے مجھے کچھ نہیں کہنا۔ گاندھی جی کی محتاجوں کی خدمت اور اچھوت پن کو دُور کرنے کی تحریک سوشلزم کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔ گاندھی ازم اور سوشلزم کے طریقوں اور زاویہ نظر میں بہت فرق ہے۔ تاریخی علم الحیات کا اصول بالکل سچا ہے اس نظر سے آپ تاریخ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مگر تاریخ پر روحانی طریقہ سے بھی غور ہو سکتا ہے۔ یہ نقطہ نظر زیادہ سچا ہے۔ دنیا اپنے پیٹ کے سہارے بھی چلتی ہے۔ اور دل کے سہارے بھی۔ مگر دل پیٹ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے — میرے خیال میں انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ گاندھی ازم فرض پر زور دیتا ہے۔ یورپ کا سوشلزم انسانی حقوق کا مطالبہ پیش کرتا ہے۔

یو۔پی کے نوّے فیصدی زمینداروں نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ہماری مدد کی تھی۔ وہ جنگِ آزادی میں ہمارے ساتھ تھے۔ محض ایک یا دو فیصدی سرکار کے ساتھ تھے۔ باقی لوگ غیر جانبدار تھے۔ زمینداروں اور کسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ میں تو انسان کے نیک خیالات پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ اگر ہم زمینداروں کو دھمکی دیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہم میں عقل نہیں ہے جب تک غیر ملکی حکومت یہاں ہے۔ تب تک ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی کے خلاف پرچار نہیں کرنا چاہیئے۔

GOVT GIRLS COLLEGE ... ACC. NO ... LIBRARY

بمبئی کے تاجروں نے ہر وقت کانگرس کا ساتھ دیا۔ کانگرس کے حکم سے
انہوں نے نقصان اٹھا کر بھی ولائتی مال فروخت نہیں کیا۔ وہ ایک مقدس
آگ تھی۔ جو غریبوں اور امیروں دونوں کے اندر جل رہی تھی۔ گاندھی جی کے
پیروکار دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولنا چاہتے ہیں۔ ایک دفعہ تو انہیں
یہ اجازت دی جائے۔ کہ وہ دنیا کو محبت سے، نفرت سے نہیں۔ فتح
کرنے کی کوشش۔ لڑائی کا علاج لڑائی نہیں۔ ہمیں جماعتی لڑائی کو ختم
کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں یہ پیغام دے دیا تھا۔ کہ سوراجیہ
کے حصول کے بعد اس کا فیصلہ ہوگا۔ کہ کون زمیندار ملک کی آزادی
کی جنگ میں کانگرس کا طرفدار تھا۔ اور کون خلاف۔ سوراجیہ حاصل کرنے
کے بعد ہم فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ کونسا اقتصادی نظام اچھا ہوگا۔ میں
زمینداروں کو یقین نہیں دلاتا کہ زمینداری سسٹم میں تبدیلی نہیں ہوگی۔
جو لوگ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں جیل گئے تھے۔ وہ دوکان کی بکری بڑھانے
کے لئے زمینداری کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ ایک اونچے خیال کی وجہ سے
گئے تھے۔ وہ اونچا خیال کبھی مٹ نہیں سکتا۔ جواہر لال نہرو اور گاندھی جی
کی تیرہ سال کی جدوجہد نے ملک کو جتنا آگے بڑھایا ہے۔ اتنا اور کسی بھی
تحریک نے کسی بھی دیگر ملک کو کبھی نہیں بڑھایا۔ جب تک گاندھی جی زندہ
ہیں۔ تب تک ملک کی رہنمائی ان کے علاوہ اور کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ دوسرا
کوئی انہیں ساتھ لیکر نہیں چل سکتا۔ ہم دعا کریں کہ گاندھی جی جب دنیا سے
جائیں۔ تو اس ملک کو آزاد کرا کے جائیں۔ ختم شد۔

سیاسی لٹریچر

آزادی کی جدوجہد میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ذیل کی ہر دلعزیز اور مقبول عام کتب پڑھیں۔

نیتاجی (با تصویر) از چمن لال آزاد اسسٹنٹ ایڈیٹر پرتاپ۔ مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے۔ کہ صرف پندرہ یوم کے قلیل عرصہ میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ قیمت للعہ

باغی جواہر۔ چمن لال آزاد کی دوسری تصنیف سیاسی حلقوں میں نہایت پسند کی گئی ہے۔ قیمت للعہ۔

میری زندگی۔ مہاتما گاندھی جی کی خود نوشت سوانح حیات۔ از شری مہادیو ڈیسائی مرحوم قیمت عا۔

جے ہند۔ خان غازی کابلی کا سیاسی نظموں کا دوسرا شاندار ایڈیشن صفحات ۱۲۸۔ قیمت عہ

تحریک خدائی خدمتگار۔ خان عبد الغفار خان (سرحدی گاندھی) کی سوانح حیات۔ تقاریر۔ مضامین کا پہلا اور شاندار مجموعہ۔ از خان غازی کابلی۔ قیمت عا۔

جے ہند پبلشرز (رجسٹرڈ) میدان بھائیاں لاہور

پرنٹر و پبلشر

دیگر سیاسی کُتب پر ایک نظر

ہندوستان میں اجنبی راج۔ از ہنڈل مون ۳ روپے

ہندوستان کا مستقبل۔ " " عہ/۸

ہندوستان کا مستقبل۔ از راجندر بابو روپے ۸/

پاکستان " " ۸/

جنرل موہن سنگھ عہ

میری رائے۔ از گاندھی عاص ۸/

ریاستی دنیا " ۱۲/

آزادیٔ ہند " ۹/

تعمیری پروگرام " ۴/

منگل پربھات " ۶/

گرہست جیون " عہ ۸/

خوراک صحت " عہ ۸/

برہمچریہ " ۱۰/

سوشلزم۔ از چھبیلداس عہ ۸/

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں۔ از: چھبیلداس ۸/

۱۸ مہینے ہندوستان میں از نہرو روپے ۸/

لڑکھڑاتی دنیا " عاص

مقدمہ آزاد ہند فوج۔ امداد صابری۔ للعہ

کستوربا گاندھی عاص ۴/

نیا الوارڈ روپے

تحریک کانگرس عاص ۱۲/

باغی لیڈر۔ از دھرم پال روپے

باغی لڑکی۔ (کیپٹن لکشمی) عاص ۴/

گونج (سیاسی نظم) کیف عرفانی عہ ۸/

سوراجیہ کا راستہ از لاجپت رائے عہ

تاریخ جرم و سزا کامل لعہ ۹

جے ہند پبلشرز (رجسٹرڈ) میدان بھاٹیاں، لاہور

پرنٹر و پبلشر۔ غلام محی الدین نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھاپا۔